بنا چھت کے گھر

(ناولٹ)

شراب بندی کے موضوع پر

کشمیری لال ذاکر

As I survey the world at the age of one hundred (1956), I am distressed by its sins and sorrows, its needs and tragedies, its wars and rumours of wars. The power of evil is great, but the power of righteousness is greater. In the glory of this faith, though the clock of my life points to the evening hour, morning is in my heart.

-Judson Brown

کشمیری لال ذاکر

نام کتاب ——————— بِنا چھت کے گھر

مُصنّف ——————— کشمیری لال ذاکر

باہتمام ——————— محکمۂ تعلّقاتِ عامّہ ہریانہ

تعداد ——————— ایک ہزار

سالِ اشاعت ——————— سنہ ۱۹۹۶ء

ملنے کا پتہ

- محکمۂ تعلّقاتِ عامّہ، ہریانہ۔ ایس۔ سی۔ او ۱۹۱-۱۸۹، سیکٹر ۱۷، چنڈی گڑھ۔

چودھری بنسی لال صاحب

وزیر اعلا ہریانہ کی نذر

جنہوں نے ایسے کروڑوں لوگوں کو چھت دینے کا عظیم منصوبہ بنایا ہے، جو بنا چھت کے گھروں میں اپنی دُکھ بھری زندگیاں گذار رہے ہیں۔

پیغام

جناب کشمیری لال ذاکر ادبی دُنیا کی مشہور و معروف شخصیت ہیں۔ اُردو شاعری میں اُن کا اپنا اہم مقام ہے۔ اور وہ ایک مُمتاز کہانی کار اور ناول نگار کی حیثیت سے طویل عرصے سے اپنے قارئین کے دلوں میں جگہ بنائے ہوئے ہیں۔

اُن کی تحریریں میں طاقت ہے۔ اُن کے الفاظ میں روانی ہے۔ اُن کے تخیّل کی پرواز میں حقیقت کی سچائی اور انسانیت کا درد خوبصورتی سے اُجاگر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی کہانیاں، ناول اور شاعری مُلک کی حدود کو پار کر کے پاکستان اور دیگر مُمالک میں بڑے اشتیاق سے پڑھی جاتی ہیں۔ کیونکہ دل کی باتیں اور دل کے رشتے مُلک، وقت اور مذہب کی حدود میں نہیں بندھتے۔

ذاکر صاحب ایک اعلیٰ درجے کے تخلیق کار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سماجی مُفکّر اور دانشور ہیں۔ اُن کی کہانیوں کے کِردار قارئین کے دلوں میں ایک چنگاری سی سُلگا دیتے ہیں۔ اُن کے ناول ایک نیا اور انوکھا درس دیتے ہیں۔

کچھ برسوں سے ہریانہ پردیش کے دیہاتی زندگی میں شراب نوشی کی بڑھتی ہوئی عادت نے قہر ڈھانا شروع کر دیا تھا۔ پہلے تو صرف چند افراد اس لت کے شکار تھے اور اب تو یہ آگ گھر گھر میں لگ گئی تھی۔

ذاکر صاحب نے اپنے اس نئے ناول "بنا چھت کے گھر" میں سماجی شراب سے دکھی ایک پریوار کی کہانی کہی ہے۔ مصنف نے کرداروں کی نفسیات اور اُن کے احساسات کو پکڑنے، اُن کا تجزیہ کرنے اور اپنی کہانی کو روانی دینے کے لئے اپنے فن کا پورا مظاہرہ کیا ہے۔

یہ ناول شراب بندی کے بارے میں، پڑھنے والوں میں ایک نئی چیتنا پیدا کرنے میں معاون ثابت ہوگا۔ اور شراب سے دکھی لوگوں کو اس سے ایک نئی سمت اور ایک نئی روشنی ملے گی۔

رام۔ ایس۔ ورما

پرنسپل سکریٹری، وزیر اعلا ہریانہ
کمشنر مالیات، و محکمہ تعلقات عامہ، ہریانہ

میری بات سُنو!

جس گھر کی چھت نہیں ہوتی، وہ گھر ہوتا ہی کہاں ہے؟ صرف دیواروں اور دروازوں اور کھڑکیوں سے تو گھر نہیں بنتا، اس کی تکمیل تو چھت ہی سے ہوتی ہے۔ بِنا چھت کا گھر تو نہ کسی کو پناہ دے سکتا ہے اور نہ تحفّظ۔ بِنا چھت کا گھر تو اپنے کسی مکیں کو نہ دھوپ سے بچا سکتا ہے نہ بارش اور طوفان سے۔ گھر کا مکمّل تصوّر ہی اس کی چھت سے ہوتا ہے۔ مکان کی چھت پڑ جائے تو اُس کا پُورا حُسن اُبھر آتا ہے۔ حُسن کا تصوّر بھی تو جبھی ہوتا ہے جب اس کا رابطہ دھوپ اور چاندنی اور خوشبُو اور شبنم سے ہو ورنہ تو حُسن کا جغرافیہ ہی سمجھ میں نہیں آسکتا۔

گھر کی چھت اور سماجی ڈھانچے کا خاکہ دونوں ہی ادھورے رہ جاتے ہیں، اگر ان میں ترتیب اور یگانگت اور مناسبت کی پَرت شامل نہ ہو۔ سماجی ڈھانچے میں ڈسپلن، نظم، توازن اور عزم نہ ہو تو سماجی ڈھانچے میں وہ لوگ کہیں فِٹ نہیں ہوتے، جن کے پاس رہنے کو گھر نہیں اور اگر ہیں تو ان کے اُوپر مضبوط اور مکمل چھت نہیں۔ اسی لیے اقتصادی لحاظ سے پسماندہ طبقوں کو زندگی بھر تحفظ کا احساس نہیں ہوتا، وہ ہر گھڑی اپنے آپ کو غیر محفوظ اور بے خانماں سمجھتے رہتے ہیں۔ اسی لیے سلمز میں رہنے والے غریب لوگ ہمیشہ ڈر کے احساس سے مَرتے رہتے ہیں، چاہے کوئی موسم ہو اُن کے لیے ایک ہی موسم کی حُکمرانی ہے اور وہ موسم ہے کڑی دھُوپ اور چھاجوں برسنے والی گھٹا کا اور منجمد کر دینے والی سَرد ہواؤں کا۔ نہ یہ گھٹا چھٹے گی اور نہ ہی وہ کبھی آسُودہ ہوں گے۔

ہندوستان کے دیہات اور شہروں سے جُڑے سلمز میں رہنے والا آدمی، تو ایک ایسے گھر میں رہ رہا ہے جس کی چھت یا تو سرے سے ہے ہی نہیں اور اگر کبھی تھی تو اسے کوئی تیز رفتار آندھی اُڑا لے گئی اور اپنے

پیچھے گرد و غبار کے گھنے بادل چھوڑ گئی اور یہ تیز رفتار آندھی مرکب ہے ان خطرناک ہواکے ریلوں کا، جن میں غربت، بیماری، اَن پڑھتا اور شراب نوشی کے عناصر آپس میں اس بُری طرح تحلیل ہیں جیسے جرائم پیشہ لوگوں کے دماغوں میں جُرم کرنے کی گہری سازشیں۔

تمام ملک میں اِن سماجی بُرائیوں کے خلاف جنگ جاری ہے، لیکن مخالف قوتیں بہت مضبوط ہیں اور مثبت کوششیں ان کے مقابلے میں کافی کمزور ہیں۔ اس لیے یہ جنگ غیر متوازن ہے۔ جیتنے کے امکانات کم ہیں، ہارنے کے زیادہ۔ اسی لیے لاکھوں اور کروڑوں لوگ اپنے نظام سے انصاف پانے کی حسرت دل میں لیے ہی دنیا کو چھوڑ جاتے ہیں۔ اتنی زیادہ سماجی برائیوں کی آندھیاں کچّے گھروں اور جُھگی جھونپڑیوں پر ٹین کے ٹکڑوں اور ترپالوں کے ٹکڑوں سے بنی چھتوں کو لمحوں میں اُڑا کر لے جاتے ہیں اور خاندانوں کے افراد گھر کی دیواروں میں رہتے ہوئے بھی بے گھر ہو جاتے ہیں۔ بچّے ماؤں اور باپوں کے ہوتے ہوئے بھی یتیم ہو جاتے ہیں۔ سُہاگنیں ماتھوں پر سُرخ سُرخ بندیاں سجائے اپنے خاوندوں کے رہتے ہوئے بھی بیوہ ہو جاتی ہیں اور معصوم کنواری لڑکیاں آنکھوں میں مستقبل کے خواب سجائے ہوئے بھی بے خواب اور ویران آنکھوں سے اپنے ماحول کو مایوس نگاہوں سے دیکھتی ہیں۔ اگر ان سب معصوم لوگوں کو زندہ اور خوش رہنے اور پُر اُمید زندگیاں گذارنے کی ہم تمنا کرتے ہیں، تو پھر یہ بھی ضروری ہے کہ ہم مخالف قوتوں کے خلاف اپنی جنگ بھرپُور انداز سے جاری رکھیں۔ جنگ میں عزم اور اِستقلال کم ہوگا تو ہم ہار جائیں گے اور مُلک کے کروڑوں اِنسان بِنا چھتوں کے گھروں میں پڑے اپنے نصیبوں کو روتے رہیں گے۔

میرا یہ چھوٹا سا ناوِل ایسی ہی ایک سماجی بُرائی کے خلاف لڑنے کا ایک اشارہ ہے۔ وہ بُرائی شراب نوشی ہے، جس نے کئی گھر، کئی خاندان، کئی نسلیں اور کئی آبادیاں اجاڑی ہیں۔ ہماری حکومت نے پُوری طاقت سے دھاوا بولا ہے، اِسس سماجی بُرائی پر اور ہریانہ کے لاکھوں لوگ اس جنگ میں اپنی تمام تر اِیمانداری اور خلوص سے شامل ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ہم اپنی جدّ و جہد میں کامران ہوں گے۔

کشمیری لال ذاکر

ہریانہ اُردو اکادمی، پنچکولہ

بیرلی گاؤں بہت بڑا گاؤں تو نہیں، لیکن آبادی کے لحاظ سے چھوٹا بھی نہیں۔ یہ گاؤں ضلع مہندر گڑھ کی سیما پر آباد دس بارہ گاؤں میں سے ایک ہے۔ اِس گاؤں کے چھ سات کلومیٹر کے بعد راجستھان کی سیما شروع ہو جاتی ہے۔ بیرلی گاؤں کے لوگوں کا راجستھان میں پڑنے والے نزدیک کے گاؤں میں آنا جانا لگا رہتا ہے۔ گاؤں کی اپنی پنچایت ہے اور اس میں سبھی جات برادری کے لوگ رہتے ہیں۔ ان میں جاٹ بھی ہیں، اہیر بھی ہیں اور راجپوت بھی۔ کچھ گھر براہمنوں کے بھی ہیں اور کچھ بنیوں کے بھی۔ پانچ سات گھر مسلمانوں کے بھی ہیں۔ ان میں وہ لوگ شامل ہیں جو بٹوارے کے بعد پاکستان نہیں گئے تھے۔ گاؤں کے باہری حصّے میں پچھڑی جاتی کے لوگ رہتے ہیں، جن میں سے زیادہ تر تو جاٹوں اور اہیروں اور راجپوتوں کے کھیتوں میں کام کرتے ہیں۔ پچھڑی جاتی کے کئی لوگ اِدھر اُدھر مزدوری بھی کرتے ہیں۔ گاؤں کی مُسلم آبادی بھی مزدوری ہی کرتی ہے۔ کُچھ کے اپنے چھوٹے سے کھیت بھی ہیں اور کچھ لوگ دوسروں کے کھیتوں میں بٹائی پر کام کرتے ہیں۔

گاؤں میں ایک مڈل سکول بھی ہے۔ آٹھویں پاس کرنے کے بعد کچھ بچّے تو نویں میں داخلہ لینے کے لئے نانگل گاؤں میں جاتے ہیں جو سیما کے لحاظ سے راجستھان میں پڑتا ہے۔ یہ بچّے صبح ہی پیدل اسکول جاتے ہیں اور شام کو واپس اپنے گاؤں آجاتے ہیں۔ لیکن زیادہ تر بچّے آٹھویں کے بعد پڑھائی چھوڑ دیتے ہیں۔ لڑکیوں میں سے تو ایک نے بھی آٹھویں کے بعد پڑھائی جاری نہیں رکھی۔ آٹھویں تک پڑھنے والی لڑکیوں کی بھی تعداد بہت کم

ہے۔ لڑکیوں کو سکول بھیجنے کا رواج تو ہے ہی نہیں' لڑکیاں یا تو ڈھور ڈنگروں کے ساتھ رہتی ہیں یا پھر ماں باپ کے کام پر جانے کے بعد اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کو سنبھالتی ہیں' پڑھائی لکھائی سے محروم ہی رہ رہی ہیں گاؤں کی اکثر لڑکیاں' یوں تو گاؤں میں پرائمری ہیلتھ سنٹر کی بھی شاخ ہے لیکن اُس کا فائدہ اُٹھانے والے بہت کم لوگ ہیں۔ چھوٹے طبقوں کے لوگ زیادہ تر ان پڑھ ہیں اور دقیانوسی بھی۔ عورتیں ہیلتھ سنٹر میں جانے کے بجائے گاؤں کے نیم حکیموں اور جادو ٹونا کرنے والوں کے پاس جا کر پیسہ ضائع کرتی ہیں اور بنا کارن دُکھ بھوگتی رہتی ہیں۔

گاؤں کے اُس طبقے میں' جس طبقے کی یہ کہانی ہے' ایک بڑی عجیب سی رسم ہے۔ جب اس طبقے کے کسی گھر میں لڑکا پیدا ہوتا ہے تو سال بھر کے اندر اُس کے سر کے بال اُسترے سے مُونڈے جاتے ہیں اور لڑکا اس عذاب کے دوران زور زور سے چیختا رہتا ہے' لیکن اُس کی طرف کوئی دھیان نہیں دیتا۔ یہ رسم وہ اپنے گاؤں میں ادا نہیں کرتے بلکہ راجستھان کی سیما پر آباد ایک بہت پُرانے اور دقیانوسی لوگوں سے آباد' سیرسی گاؤں میں ادا کرنے جاتے ہیں۔ اس رسم کی وجہ سے کبھی کبھی یہ سویا ہُوا چھوٹا سا گاؤں کُچھ دیر کے لئے جاگ جاتا ہے۔ سیرسی گاؤں کے باہر ایک قریب قریب سُوکھے ہُوئے جوہڑ کے کنارے بڑھ کا ایک پُرانا پیڑ ہے' جس کا آدھا حصّہ سوکھ چکا ہے' اس پیڑ کے نیچے کسی پیر کا پُرانا سا مزار ہے۔ بچّے کے بال' اُسی مزار کے پاس' سُوکھے ہُوئے جوہڑ کے کچّے کنارے پر مُونڈے جاتے ہیں اور مزار کے اندر سویا پیر بچّے کی چیخوں کو آرام سے سُنتا رہتا ہے۔ گاؤں میں نائیوں کا بس ایک ہی کُنبہ ہے جو سیرسی گاؤں کے بچّوں کے بال مُونڈتا ہے۔ گاؤں میں نائیوں کے چار گھر اور بھی ہیں لیکن یہ کام صرف ایک ہی کُنبے کے نائی کرتے ہیں۔ اس رسم کے بعد بچّے کے ماں باپ' وہیں جوہڑ کے کنارے اِدھر اُدھر سے لکڑیاں اکٹھا کر کے آگ جلاتے ہیں اور گُڑ کا حلوہ بناتے ہیں اور اُسے سارے گاؤں کے بچّوں میں بانٹتے ہیں۔ پھر وہ لوگ ڈھول بجاتے ہُوئے اپنے گاؤں لوٹ جاتے ہیں۔

پیر کے اِس مزار سے جڑی ہوئی ایک رسم اور بھی ہے۔
بیرلی گاؤں کے اُس طبقے کے کسی کنبے میں سے، جس سے سروپے کا تعلق ہے، جب کسی لڑکے کی شادی ہوتی ہے، تو دولہا سہاگ رات سے پہلے اپنی بیوی کے ساتھ سیرسی گاؤں کے باہر، سوکھے ہوئے جوہڑ کے کنارے، بڑ کے درخت کے نیچے، اُس پیر کے کچے مزار پر، حاضری دینے ضرور جاتا ہے۔ لیکن اُس مزار کا کوئی مجاور نہیں، اس لئے حاضری دینے والے کو تبرک کے طور پر وہاں سے کچھ نہیں ملتا۔ نائیوں کے اُسی خاندان سے، جو بچے کے سر کے بال مونڈتا ہے، سب سے بڑی عمر کی عورت ہر جمعرات کو، سورج ڈوبتے ہی اُس مزار پر چراغ جلاتی ہے اور یہ رسم بھی اُتنی ہی پرانی ہے جتنا پرانا کہ وہ مزار ہے۔ روایت ہے کہ یہ پیر دراصل بال مونڈنے والے نائیوں کے خاندان کا ہی پیر ہے لیکن مانتے اُس کو گاؤں کے سبھی لوگ ہیں۔ بلکہ سب اُسے سیرسی گاؤں کا محافظ تصور کرتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ بٹوارے کے فوراً بعد، بیرلی گاؤں کا ایک لڑکا جو فوج میں تھا اور چھٹی لے کر شادی کے لئے گاؤں آیا تھا، شادی کے بعد، سہاگ رات سے پہلے اپنی بیوی کے ساتھ سیرسی گاؤں کے اُس مزار پر حاضری دینے نہیں گیا تھا۔ ماں کے بار بار کہنے کے باوجود وہ اُسے اندھ وشواس کہہ کر ٹالتا رہا اور اپنے دوستوں کے ساتھ شراب پیتا رہا۔ گاؤں کے لوگوں کا کہنا ہے کہ سہاگ رات کو جب وہ لڑکا نشے میں چور، آدھی رات کو اپنی بیوی سے سبھوگ کرنے لگا۔ تو اُس کے سر پر زور زور سے ہتھوڑے برسنے لگے تھے اور وہ ننگی حالت ہی میں بے ہوش ہو گیا تھا۔ اُس کی بیوی ایکدم گھبرا گئی تھی لیکن اُس نے اونچی آواز میں شور مچانے سے پہلے اپنے بے سُدھ خاوند کو کپڑے پہنا دیئے تھے۔ جب دُلہن کی چیخیں سن کر لڑکے کے گھر والے چوبارے میں پہونچے تو لڑکے کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا اور اُس کا سارا بدن بُری طرح کانپ رہا تھا۔ لڑکے کو جس وقت ہوش آیا وہ اپنا دماغی توازن کھو چکا تھا اور اسی قسم کے ایک شدید دورے کے دوران اُس کی موت ہو گئی تھی۔

یہ ہے اُس گاؤں کا پس منظر' جس کا نام بیرلی ہے۔ اور جو ضلع مہندر گڑھ کے اُن آخری چند گاؤں میں سے ہے جن کی سیما راجستھان سے ملتی ہے اور جہاں کے لوگ جو زبان بولتے ہیں وہ ہریانوی اور راجستھانی کا مُرکب ہوتی ہے' جسے اِس علاقے سے باہر کا عام آدمی پُوری طرح سے نہیں سمجھ سکتا۔

گاؤں کی باہر والی سیما پر جو گھر ہیں اُن میں سے ایک گھر سُروپا کا بھی ہے' اُس کے ساتھ اس کی بیوی انارو' اُس کا بیٹا کالی چرن اور اُس کی بیٹی گجری رہتے ہیں۔ سُروپا بڑا اچھا آدمی ہے۔ وہ اپنے چھوٹے سے کھیت میں ایمان داری سے جان توڑ محنت کرتا ہے۔ اُس کی بیوی انارو بھی کام میں اُس کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ تھوڑا بہت کام کالی چرن بھی کرتا ہے۔ گجری کی عُمر تو یہی سات آٹھ برس کی ہے لیکن وہ گھر کا سارا کام کاج کرتی ہے۔ یہ چھوٹا سا کُنبہ بڑے امن چین سے رہتا ہے۔ کسی سے اِن کا جھگڑا نہیں۔ جب پکی فصل کاٹنے کا موسم آتا ہے تو سُروپا اور اُس کی بیوی اپنے کھیت کی فصل کاٹ لینے کے بعد اور اُسے کھیت ہی میں دو چار جگہوں پر پُولوں کی شکل میں اکٹھا کر لینے کے بعد' اہیروں کے کھیتوں میں بھی مزدوری پر فصل کاٹنے کا کام کرتے ہیں۔ اس سے انہیں رقم بھی مل جاتی ہے اور کچھ اناج بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ سُروپے کے گھر کا گذارہ ٹھیک طرح سے چل رہا ہے۔ انارو کو گھر سنبھالنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔

گھر کا ڈھانچہ بس اُس دن سے بگڑنا شروع ہُوا جس دن سُروپے نے اپنی بیٹی گجری کا چھوٹی ہی عُمر میں بیاہ کر دیا۔ بیاہ اُس نے اپنی ہی جات برادری میں' راجستھان کے ایک نزدیک کے گاؤں میں کیا۔ راجستھان کے گاؤں میں بچّوں کا چھوٹی ہی عمر میں بیاہ کر دینے کا پُرانا رواج ہے۔ بلکہ سال میں ایک خاص دن مقرر ہے جب چھوٹے چھوٹے بچّوں کے' سینکڑوں کی تعداد میں' ایک ہی جگہ پر سامُوہک طور پر بیاہ کر دیئے جاتے ہیں' جیسے گُڈے گُڈیوں کا ایک میلہ ہو رہا ہے اور اُس میلے میں بے زبان اور معصوم گُڈے گُڈیوں کی طرح دکھائی دینے والے بچّوں کو اچانک پتی پتنی بنا دیا جاتا ہے اکثر اس بھیڑ بھڑکے والی رسم کے دوران معصوم بچّے سو جاتے ہیں اور اُن کے ماں باپ اُنہیں گود میں اُٹھائے

پھیروں کی رسم ادا کروا دیتے ہیں۔
اُس شام خوب ڈھول بجتے ہیں، لذیذ پکوان پکتے ہیں اور کچی شراب ساون کی گھٹا کی طرح کھل کر برستی ہے اور گاؤں کے باسیوں کو نشے میں سَرابور کر دیتی ہے۔
اور اُسی شام سینکڑوں غریب باپ قرضے کے جنگل میں پھنس جاتے ہیں اور ساری عمر اس قید کو بھوگتے ہیں۔ یہ ایک ایسی قید ہے جس کے قاعدے قانون صرف کچھ ہی لوگ تیار کرتے ہیں جن کے پاس بہت پیسہ ہے اور جو پیسے کے اس کاروبار میں دیہات کے غریب اَن پڑھ اور ضرورت مند لوگوں کو بڑی ہوشیاری سے شامل کر لیتے ہیں اور سمے سمے پر اپنے بہی کھاتوں میں اُن کے انگوٹھوں کے نشانوں کی تعداد بڑھاتے رہتے ہیں، جس کے ساتھ ساتھ اُن غریب لوگوں کی قید کی میعاد بھی بڑھتی رہتی ہے۔
گجری کے بیاہ کے کچھ ہی دن پہلے اُس کے باپ سروپے نے اپنے آپ کو گاؤں کے لالہ کے بہی کھاتوں میں قید کروا ڈالا اور اُس کی تصدیق میں کالی سیاہی میں سنے اپنے ہی انگوٹھے کا نشان لگا دیا۔
سروپا ولد کالو نے پانچ ہزار کی رقم کے بدلے میں اپنا کھیت لالہ کے پاس رہن رکھ دیا اور لالہ کے اس احسان کے بدلے میں اُسکے آگے ہاتھ بھی جوڑے اور اس کا احسان بھی مانا۔
بیاہ کے بعد جب گجری کی ڈولی چلی گئی تو سروپے کے رشتہ دار تھکے ماندے درختوں کی چھاؤں میں ڈالی کھاٹوں پر لیٹ گئے اور انتظار کرنے لگے شام کا جب سروپا چودھری دارو سے اُن کی خاطر کرے گا۔ اُس شام دارو کی گھٹا کھل کر برسی اور کچھ ہی روز پہلے قرضے کے ڈالے ہوئے بیج سروپے کے چھوٹے سے کھیت میں لہلہا اُٹھے۔ قرضے کی اس فصل کو جوان ہونے میں کئی برس لگ گئے۔ جب یہ فصل پکّی اور کاٹے جانے کے قابل ہوئی تو اُس سمے تک سروپے کے ہاتھ پاؤں شل ہو چکے تھے۔ اب وہ قرضے کی اس فصل کو کاٹنے اور اُسے سنبھالنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ بنا کسی کے جانے، لالہ کے بہی کھاتوں میں ہی، قرضہ ادا کرنے کی ذمہ داری اُس کے بیٹے کالی چرن پر ڈال دی گئی۔
اس دوران دیش کی سیماؤں پر جنگ چھڑ گئی تھی اور سروپے کا بیٹا کالی چرن اپنی

پڑھائی بیچ ہی میں چھوڑ دینے کے کچھ سال بعد فوج میں بھرتی ہو گیا تھا۔ مہندر گڑھ ضلع کی یہ روایت رہی ہے کہ یہاں کے گبرو، وقت پڑنے پر، سدا ہی مُلک کی حفاظت کے لئے فوج میں بھرتی ہوئے ہیں اور اپنی بے مثال قربانیوں کے لئے انہوں نے بڑے بڑے قومی اعزاز بھی حاصل کئے ہیں۔

شروع شروع میں تو کالی چرن اپنی ماں کو خط لکھتا رہا، جسے وہ دوسروں سے پڑھواتی تھی اور اُن کے جواب بھی دوسروں ہی سے لکھواتی تھی۔ کچھ دیر کے بعد خط لکھنے کا وقفہ بڑھتا گیا۔ کیونکہ اُس کی رجمنٹ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی رہتی تھی دُوسرے تیسرے مہینے وہ کچھ رقم بھی سروپے کو بھیج دیتا تھا اور اُسے تاکید کرتا تھا کہ وہ اس رقم سے لالہ سے قرضے پر لئے روپوں کا سود ادا کر دیا کرے۔ کالی چرن کی بھیجی ہوئی رقم بھی بہت زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ سروپا چاہتا تو سود کے پیسے لالہ کو دے ہی سکتا تھا، لیکن مہنگائی اتنی زیادہ ہو گئی تھی اور اُسے نشے کی لت بھی لگ گئی تھی اس لئے سروپا لالہ کو سُود کی رقم کبھی بھی نہ دے سکا اور اس طرح گُجری کے بیاہ پر قرضے کی رقم بڑھتی گئی اور سروپے کا اپنے کھیت سے جس کو وہ لالہ کے پاس گروی رکھ چکا تھا رشتہ دھیرے دھیرے کمزور پڑتا گیا۔ البتہ قرضے کی فصل کئی ہاتھ اُونچی ہوتی گئی اور اب اُس میں کھڑا ہو کر اگر سروپا کبھی اپنے کچّے گھر کو دُور سے پہچاننے کی کوشش کرتا تو وہ اُسے آسانی سے پہچان بھی نہ سکتا۔

آہستہ آہستہ سروپے کی زندگی میں ایک ایسی منزل آگئی۔

جہاں اُس کا اپنے کھیت سے رشتہ کٹنے لگا۔

اور گھر اور کھیت کا آپسی سمبندھ بھی ٹوٹنے لگا۔

سروپا اَن پڑھ تو ضرور تھا لیکن اپنے گھر اور اپنے کھیت سے ٹوٹتے ہوئے رشتے کا احساس اُسے کبھی کبھی دُکھی بھی کر دیتا تھا۔ اُس کا یہ دُکھ اُس دن اور بھی زیادہ ہو جاتا جس دن کالی چرن کا منی آرڈر آتا اور وہ منی آرڈر فارم پر انگوٹھے کا نشان لگا کر ڈاکئے سے رقم وصول کرتا۔ اُس دن سروپے کا اپنی بیوی انارو کے ساتھ ضرور ہی جھگڑا ہوتا کیونکہ

وہ اُسے قرضے کی رقم کا سُود ادا کرنے کو کہتی۔ اُس دِن بھی ایسی ہی بات ہُوئی۔

"کتنے روپے بھیجے ہیں کالی چرن نے؟" انارو نے پُوچھا۔

"جتنے بھی ہوں۔ تمہیں کیا لینا ہے اس بات سے؟" سرُوپے نے تیکھے پن سے جواب دیا۔

"سُود کی کچھ رقم تو لالہ کو لوٹا دو۔"

"اور باقی روپے تمہیں دے دوں۔"

"گھر کی کاندھ گر گئی ہے، اُسے ٹھیک کرالو۔ ڈھ جائے گی ساری۔"

"ڈھ جان دے۔"

"چھت بھی بہت چُوئے سے۔"

"چُونے دے۔"

"گھر چاہے بیران ہو جا، تُو سراب نہ چھوڑے گا۔"

"نہیں چھوڑوں گا۔"

"ایک ایک ٹُوم بھی بیچے گا میری؟"

"جرُورت ہو گی تو وہ بھی بیچ دُوں گا۔"

"بیچ کے دیکھ تو۔"

انارو کے اس جواب سے سرُوپا آپے سے باہر ہو گیا اور ایک بھرپُور تھپّڑ جڑ دیا اُس کے گال پر۔

انارو چیخ اُٹھی اور سرُوپے کو اُونچی اُونچی آوازیں کوسنے لگی۔

ماں کی آواز سُن کر کمرے کے اندر کھاٹ پر پڑی گُجری اُٹھ کر باہر آنگن میں آگئی۔

"دیکھ لے اپنے باپ کے لچھن۔" انارو نے ڈُسکتے ہوئے گُجری سے کہا۔

"چاچا یہ تو گھنی بھونڈی بات سے۔"

"جبان کاٹ دُوں گا تیری۔"

"کاٹ دے چاچا۔ یو بھی کر کے دیکھ لے۔" گُجری نے جواب دیا۔

سرُوپا گُجری پر ہاتھ اُٹھانے لگا تو وہ پیچھے ہٹ گئی۔ ورنہ چپیٹ میں آجاتی۔

تیں نے تو گھر میں ناگنیں پال رکھی ہیں۔ ایک نہیں دو دو۔ ہر بخت ڈنگ مارے ہیں۔"
سروپا زور سے بڑبڑایا اور پھر دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ نہ وہ دوپہر کو گھر آیا نہ شام کو۔
لالہ کی دکان پر گیا اور اس کے بہی کھاتے میں کالی سیاہی سے پھر انگوٹھے کا ایک اور نشان
چیپ آیا۔
پھر اس نے ٹھیکے سے شراب کا ادھیہ لیا اور اپنے رہن رکھے کھیت کی طرف
چلا گیا۔ مینڈھ پر بیٹھے بیٹھے ہی اس نے بوتل خالی کر دی اور پھر اپنے پٹکے کو سر کے
نیچے رکھ کر مینڈھ پر ہی سو گیا۔ کھیت پر اس کا ادھیکار تو ختم نہیں ہوا تھا لیکن
اسے لگتا تھا کہ تھوڑی ہی مدت بعد اس کا یہ ادھیکار چھن جائے گا۔
سورج ڈوبنے کے بعد جب وہ گھر پہونچا تو گجری اور اس کی ماں ایک ہی کھاٹ
پر پڑی تھیں۔ سرہانے کی طرف انارو کا سر تھا اور پائینتی کی طرف گجری کا سر۔
دیا کبھی نہیں جلایا تھا دونوں میں سے کسی نے۔
چولھے میں بھی آگ نہیں جلائی تھی۔
کھانے کو بھی کچھ نہیں پکایا تھا۔
اندھیرے ہی میں سروپے نے دیوار کے ساتھ کھڑی کھاٹ کو آنگن کی ایک طرف
ڈال دیا اور اس پر گر گیا۔
اس رات گھر کے تینوں جنے، سروپا، انارو اور گجری بھوکے پیٹ سو گئے۔
کسی نے کسی سے بات نہیں کی۔
کھلے آسمان کے نیچے تاروں کی چھاؤں میں اپنی اپنی سوچوں کی آگ میں جلتے رہے
تینوں، اور رات دھیرے دھیرے گذرتی رہی۔ اور چاند اپنی نپی تلی رفتار سے آکاش میں
اپنی منزل کی طرف بڑھتا رہا۔ کیوں کہ اس کی تو ایک منزل تھی جس پر اسے بھور تک
پہونچنا ہی تھا۔ نہیں تھی کوئی منزل تو ان کی نہیں تھی جو اپنے گھر کے ناہموار صحن میں اپنی
اپنی کھاٹوں پر پڑے جاگ رہے تھے۔
گجری اب عمر کی اس منزل پر آ گئی تھی جہاں چھوٹی عمر میں بیاہ دی گئی ہوئی لڑکیاں

اپنے ماں باپ کا گھر چھوڑ کر سسرال چلی جاتی ہیں۔

گجری کی سسرال والے تقاضا کرنے لگے تھے کہ گجری کا گونا کر دیا جائے تاکہ وہ بیر لی آکر اُسے ساتھ لے جائیں۔ سروپا اُنہیں گونے کی تاریخ اس لئے نہیں بتا پا رہا تھا کہ گونے کی رسم پر جو رقم خرچ ہوتی تھی، وہ اُس کے پاس نہیں تھی۔ کالی چرن نے کچھ روز پہلے منی آرڈر سے جو رقم سروپے کو بھیجی تھی وہ تو خرچ ہو گئی تھی۔ اس بار انارو اور گجری کے بار بار کہنے پر کالی چرن کے بھیجے ہوئے روپیوں کا زیادہ حصہ تو آنگن کی گری ہوئی دیوار کو دوبارہ بنوانے میں خرچ ہو گیا تھا۔ جو رقم بچی تھی اُسے سروپے نے شراب پر خرچ کر ڈالا تھا۔ اب اُس کے پاس کچھ بھی نہیں بچا تھا۔

گجری کی سسرال سے ایک اور خط آیا تھا۔

اُنہوں نے خود ہی گونے کی تاریخ مقرر کر کے لکھ دی تھی۔

اب سروپے کے پاس کوئی بہانہ نہیں تھا گونے کی تاریخ کو ٹالنے کا۔

گجری نے بھی اپنی ماں سے کہا تھا کہ اب ٹال مٹول کرنے کے بجائے اُس کی سسرال والوں کی بات مان لینی چاہئے، نہیں تو وہ وہاں جا کر پریشان ہو گی۔

اُس رات سروپے اور انارو کے بیچ جو بات چیت ہوئی اُسے گجری بھی خاموشی سے سنتی رہی۔ وہ بولی کچھ نہیں۔

"گجری کے باپو اب کے بچار سے نیرا۔"

"کیا کہوں؟"

"اب کے گجری کا گونا کر دو۔"

"کیسے کر دوں۔ کھرچا کیسے ہوگا؟"

"اب تو چھوری بھی اُتاولی ہو رہی سے۔"

"وہ تو اُتاولی ہووے گی ہی۔"

"بیاہ کے بعد چھوریاں گھر تھوڑا ابیٹھی رہویں؟"

"پھانسی لگاؤنگی مجھے؟"

"تُم تو سدا اُلٹی بات کرو سوُ گُجری کے باپو۔"

"تو کے کروں؟"

"ایک آدھ ٹُومب بیچ دے میری۔"

"تمہاری ٹُومب بیچ دوں؟"

"اور کیا؟ چھوری کو ٹھکانے لگا سُروپے چودھری۔"

انارو کی بات سُن کر سُروپے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جس پیار سے آج انارو نے اُسے مخاطب کیا تھا اُس سے پہلے وہ اُسے اس طرح مخاطب کرتی تو وہ قربان نہ ہو جاتا اُس پر۔ پھر تو وہ اتنا بگڑتا کبھی نہیں۔ کچھ نہ کچھ تو سنبھلا ہُوا ہی رہتا۔ پیار کی کمی اور اوہیلنا کبھی تو برباد کر ڈالتی ہے آدمی کو۔ انارو کمرے کے اندر جا کر اپنا لکڑی کا صندوق کھول رہی تھی۔ گُجری بھی دہلیز پر کھڑی اُسے دیکھ رہی تھی۔

سُروپے نے اپنی گیلی آنکھیں قمیض کے دامن سے پونچھ لیں۔

اُسی کھشن انارو ہاتھ میں چاندی کے دو بڑے بڑے کڑے لے کر آ گئی۔

"یہ لے اور انہیں آج ہی بیچ دے گُجری کے باپو۔" انارو نے چاندی کے دونوں وزنی کڑے سُروپے کو تھما دیئے۔

"یہ نہیں ہو گا انارو چودھرن۔"

"یو تو کرنا پڑے گا۔"

اتنے میں گُجری بھی پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔

"چاچا یہ مت کرو۔ میں تمہارے دھورے ہی رہوں گی۔" گُجری بولی

"مشکل بات سے یہ چھوری۔" انارو نے جواب دیا۔

"میں کچھ کھا لوں گی۔"

"ناک کٹوائے گی مہاری؟" سُروپے نے پاس کھڑی گُجری کا ہاتھ پکڑتے ہوئے غصے سے کہا۔

گُجری زور زور سے رونے لگی اور پھر ہاتھ چھڑا کر روتے روتے ہی باہر آنگن

میں پڑی کھاٹ پر گر گئی۔

اُسی دن شام کے وقت سروپے نے لالہ کے پاس انارو کے چاندی کے دو وزنی کڑے بیچ دیئے۔

"سروپے چودھری تُو تو گھنا ساہوکار ہو رہیا سے۔"

"لالہ مجھ سے مسکھری مت نہ کر۔"

"مسکھری تھوڑی کروں، چھوری کے بیاہ پہ تو کھیت رہن رکھدیا اور اب اتنے برس بعد گونے کے واسطے گھر والی کی ٹُومبیں بیچ رہیا سے چودھری۔"

یہ کہہ کر لالہ ہنسنے لگا اور چاندی کے کڑے چھوٹے سے ترازو میں رکھ دیئے۔

سروپا کی آنکھیں بڑے بڑے آنسوؤں سے بھر گئیں، اُسے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

لالہ نے جتنی رقم دی سروپے نے بنا کسی حجّت کے اپنے انگوچھے میں ڈال لی۔

"رقم تو گِن لے چودھری۔"

"جرورت نہیں سے۔"

جب سروپا اُس کی دکان سے باہر جانے کے لئے اُٹھا تو لالہ بولا۔

"کھیت کے رہن کی میعاد بھی ختم ہو رہی سے سروپے۔"

سروپا لالہ کی بات کا جواب دیئے بغیر اُس کی دکان سے باہر نکل آیا۔ اُس نے سنا لالہ ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"سالے کے بُرے دِن آ گئے اِب۔"

سروپا سر جھکائے گلی میں آگے بڑھ گیا۔ اُس کا خیال تھا کہ کسی نے اُسے لالہ کی دکان سے نکلتے ہوئے دیکھا نہیں۔ لیکن اُس کا یہ خیال غلط تھا۔

گُجری کی سُسرال سے صرف پانچ جنے آئے تھے گونا کی رسم پر۔
گُجری کا گھر والا' سُورج' جسے دیکھ کر ایسے لگتا تھا جیسے وہ ابھی ابھی کسی سکول کی نویں یا دسویں کلاس سے بھاگ کر آیا تھا۔
سُورج کا چھوٹا بھائی امرو' جو عمر میں گُجری سے بھی بہت چھوٹا تھا۔
سُورج کی بہن شربتی جو شادی شُدہ تھی اور اُس کے ساتھ تین چار سال کا بیٹا تھا' جس کی ناک ہر وقت بہتی رہتی تھی۔
سُورج کا باپ' جگ پال جو ایک سیدھا سادا کسان لگتا تھا۔ اور سُورج کا ناؤ' سنہال سنگھ' جسے گاؤں میں سب تاؤ سنہالا کہہ کر مخاطب کرتے تھے' جو دن رات حُقہ گُڑگُڑاتا تھا اور جس کی آواز گلے کے بجائے ناک سے نکلتی تھی۔
سُروپے نے اپنی بساط کے مطابق آئے ہوئے مہمانوں کی خُوب خاطر کی۔ سُورج اور اُس کی بہن شربتی تو سُروپے کے گھر ہی ٹھہرے۔ باقی تینوں لوگوں کے ٹھہرنے کا انتظام چوپال میں کیا گیا۔ تاؤ سنہالا تو حُقہ گُڑگُڑاتا رہا اور ملنے والوں کو پُرانی باتیں سُناتا رہا۔ ملنے والے اُس کی باتوں سے زیادہ اُس کی ناک سے نکلتی ہُوئی قسم قسم کی آوازوں کا مزہ لیتے رہے۔ جگ پال اور اُس کا بیٹا سُروپے کے ساتھ کھیتوں میں گھومتے رہے۔
شام کو سب نے ڈٹ کر دارُو پی اور خُوب چھک کر کھانا کھایا اور پھر چوپال میں اپنی اپنی کھاٹوں پر پڑے رات بھر مچھروں کا مقابلہ کرتے رہے۔ بیرلی میں اُن کے اپنے گاؤں کے مقابلے میں مچھروں کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی اور وہ موٹے بھی بہت تھے۔
گھر میں انارو نے اپنے داماد سُورج اور اُس کی بہن شربتی کی بڑی دیکھ بھال کی۔ شربتی بے چاری تو سارا وقت اپنے روتے ہُوئے بیٹے ہی کو سنبھالتی رہی اور اپنی اوڑھنی سے اُس کی ناک صاف کرتی رہی' اُس کی اوڑھنی کا کوئی بھی حصّہ ایسا نہیں بچا تھا جس پر اُس کے بیٹے کی ناک نے گُل بُوٹے نہ کھلائے ہوں۔
رات کو بیرلی کی آخری سیما پر بسے گھروں کی عورتیں' انارو کے گھر میں گیت گاتی

رہیں اور سورج اور شربتی سے ٹھٹھا کرتی رہیں۔ سبھی خوش تھیں، سورج کی تو بس یہی کوشش رہتی تھی کہ وہ چھپے چوری گجری کو دیکھتا رہے۔ ایک بار تو اس کی بہن شربتی نے اسے ٹوکا بھی۔

"چھوری کل تیرے ساتھ ہی جا رہی ہے۔ دیکھتے رہیو جی بھر کر۔"

سورج بے چارا جھینپ گیا۔ اس کے بعد اس نے پھر آنکھ تک نہیں اٹھائی گجری کی طرف۔

سروپے اور انارو نے سب مہمانوں کو کپڑے دیئے، گجری کے لئے پانچ جوڑے کپڑے اور اس کے گھر والے کے لئے دو جوڑی کپڑے تھے۔ شربتی کے بیٹے کو بھی گاؤں سے ہی خرید کر بکّرا اور لال رنگ کی بش شرٹ دی تھی اور پھر ٹوکرا بھر کے لڈّو تھے سب کے لئے۔ انارو نے گجری کی ساس کے لئے گھاگھرا، کرتا اور مقیش جڑی اوڑھنی خاص طور پر گجری کے بکسے میں رکھے اور پھر سب مہمانوں کو وداع کیا۔

وداع کرتے وقت پاس کے گھروں کی ساری عورتیں گیت گاتے ہوئے گجری کو گاؤں کی سیما تک چھوڑنے گئیں۔ ایسے موقعے تو کبھی کبھی آتے تھے جب ان گھونٹ گھونٹ کر جینے والی عورتوں کو بھی کھل کر گانے اور اپنی آواز کو دور دور تک پہونچانے کی آزادی ہوتی تھی۔ بس یہی ایسے کھشن ہوتے تھے جب انہیں یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ بھی زندہ ہیں اور ان کی آواز بھی ہونٹوں سے باہر نکل کر فضا میں پھیل سکتی تھی۔ ان کھشنوں میں ان پر کوئی پابندی نہیں ہوتی تھی اور کچھ دیر کے لئے وہ اپنی مجبوریوں اور ناکام حسرتوں کو بھول جاتی تھیں۔ اور اپنے آپ کو پنچھیوں کی طرح آزاد سمجھنے لگتی تھیں اور مٹّی کے ان چھوٹے چھوٹے پنجرہ نما گھروں کو بھول جاتی تھیں جہاں کچھ دیر کے بعد انہیں دوبارہ قید ہو جانا تھا۔ اس وقت انہیں اپنی محرومیاں، اپنے غم، اپنی غربت، اپنے ساتھ کی جا رہی ناانصافیاں، کچھ بھی یاد نہیں تھیں۔ گجری کے گونے نے انہیں اپنی چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کی مہارانیاں بنا دیا تھا۔

خوب اونچی اور ایک آواز میں کئی پاٹ دار آوازیں ملا کر اس سمے وہ دھرتی

اور آکاش پر حکمرانی کر رہی تھیں۔

کس نے دیا رے لگن میں ہاتھی
کس نے گوئی رے مانگ بھر چوٹی
لاڈو کے دادا بڑے ساہوکار سیں
انہوں نے دیا رے لگن میں ہاتھی
کس نے دیا رے لگن میں ہاتھی
لاڈو کے تاؤ چاچا بڑے ساہوکار سیں
انہوں نے دیا رے لگن میں ہاتھی
کس نے دیا رے لگن میں ہاتھی
لاڈو کی چاچی بڑی چتر سے
انہوں نے گوئی ری مانگ بھر چوٹی
کس نے دیا رے لگن میں ہاتھی

گجری کے چلے جانے کے بعد تو سروپے کا گھر ویران ہو گیا تھا

آج اُسے پہلی بار احساس ہوا کہ گجری کے ساتھ اُس کی زندگی کا بہت کچھ چلا گیا تھا۔ گاؤں کی سیما سے وہ اکیلا ہی واپس آیا تھا۔ انار وا بھی گاؤں کی عورتوں کے ساتھ ہی تھی۔ وہ آنگن میں اُگے نیم کے تنے سے لگ کر دیر تک روتا رہا۔ اُسے لگا جیسے اُس کا سارا کچھ ہی لُٹ گیا تھا اور پھر وہ اپنے کرتے کے چھور سے اپنی آنکھیں پونچھتا ہوا جھلنگا کھاٹ پر گر گیا۔ اُس نے آنکھیں موند لیں۔ دھیرے دھیرے اُس پر نیند کی کیفیت طاری ہو گئی اور پھر شاید وہ سو بھی گیا۔

اُس کی بند آنکھوں کے سامنے اُس کا سارا ماضی اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ پھیل گیا۔

اِسی گھر میں تو وہ پیدا ہوا تھا۔

اُس کی ایک بہن بھی تھی جو اُس کے پیدا ہونے سے پہلے ہی مر گئی تھی۔

اُسے بڑی ماتا نکلی تھی۔ اُن دنوں اس بیماری کا کوئی علاج بھی تو نہیں تھا۔ گاؤں کے باہر بنے پرانے ماتا کے مندر میں اُس کی ماں، اس کی بہن کو لے گئی تھی اور گاؤں کے ایک اوجھا نے نیم کی شاخوں سے اُس کا جھاڑا کیا تھا اور اُپلوں پر نیم کے پتوں کو کئی دن تک جلایا تھا۔ لیکن اُس کی بہن کی بیماری میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا اور ایک رات وہ درد سے چیختی چلاتی اچانک خاموش ہوگئی تھی۔ اور اُس کا مُردہ جسم کچے فرش پر پڑا رہا تھا۔ اور پھر اُس پر گنگا جل کے چھینٹے مارے گئے تھے اور اُسے گاؤں کے باہر مڑھیوں کے پاس دھرتی میں گہرا دبا دیا تھا۔ اُس کے باپ اور ماں نے ماتا کے مندر میں جا کر کشما مانگی تھی اور دیوی ماتا سے پرارتھنا کی تھی کہ وہ اُن کے گھر کو اپنے کوپ سے مُکت کر دے۔

اُسے یاد آرہا تھا کہ گھر کی ڈیوڑھی کے اندر بیٹھ کر اُس کا باپ جوتیاں گانٹھا کرتا تھا۔ اس کام کے بدلے میں گاؤں والے فصل کی کٹائی کے بعد اُسے کچھ اناج دے دیا کرتے تھے جس سے اُس کے گھر کا گذارہ چلتا رہتا تھا۔ اس کے باپ کی ایک آنکھ میں سفید پھولا تھا۔ اس آنکھ سے اُسے کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ جوتیاں گانٹھنے کا کام وہ ایک ہی آنکھ سے کرتا تھا لیکن اُس کا کام بہت سُتھرا ہوتا تھا۔ اِس لئے آس پاس کے گاؤں والے بھی اُس کے باپ ہی سے جوتیاں بنواتے تھے۔ اور اُسے ایک آنکھ والا ہرن کہہ کر آپس میں اُس کا ذکر کرتے تھے۔ ہرن اس کو وہ اس لئے کہتے تھے کیوں کہ وہ بہت تیز چلتا تھا اور بڑے لمبے لمبے ڈگ بھرتا تھا۔

سروپے کو یہ بھی یاد آرہا تھا کہ جب وہ پیدا ہوا تھا تو سارے گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی تھی کہ ایک آنکھ والے ہرن کے گھر دو آنکھ والا میمنا پیدا ہوا تھا۔ گاؤں والوں نے اُسے میمنا کیوں کہا تھا اِس کے بارے میں اُسے کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ اتنا تو اُسے اب بھی یاد تھا کہ جب وہ بڑا ہوا تھا تو اُسے جوتیاں گانٹھنے کا کام پسند نہیں تھا۔ کچے چمڑے کو پانی میں گیلا کرنے سے جو ایک خراب سی بو آتی تھی۔ وہ اُسے پسند نہیں تھی۔ وہ جب بھی کچے گیلے چمڑے کو سونگھتا اُسے اُبکائی آجاتی۔ اس کا باپ اُسے

ڈانٹتا اور کہتا - سالا نواب بن رہیا ہے۔

وہ نواب تو خیر کیا بنتا لیکن جوتیاں گانٹھنے کا کام اُس نے نہیں کیا۔

اُسے آخر جو کام ملا، وہ تھا اہیروں اور راجپوتوں کے ڈھور ڈنگروں کو چرانے کے لئے جانا اور شام کو انہیں اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہونچانا۔ ان ڈنگروں میں کچھ بکریاں بھی اُس کے ذمے تھیں۔ جن گھروں کے ڈنگروں کی وہ رکھوالی کرتا تھا وہ انہیں اپنی اپنی باری کے مطابق ہر صبح چار روٹیاں اور اچار دے دیتے تھے۔ جنہیں کھا کر وہ کنوئیں کا پانی پی لیتا اور کسی درخت کی چھاؤں میں تھوڑی دیر سو لیتا۔ کبھی کبھی وہ ایسا کرتا کہ دودھ دینے والی کسی بکری کے دودھ بھرے تھنوں سے میمنے کی طرح اُس کا دودھ چوسنگھ لیتا۔ اب اُسے معلوم ہوا کہ اُس کے پیدا ہونے پر گاؤں والوں نے اُسے دو آنکھوں والے میمنے کا جو لقب دیا تھا وہ ٹھیک ہی تھا۔

کھاٹ پر پڑا سرویا آنکھیں بند کئے اپنی ماضی کی جو تصویریں دیکھ رہا تھا اُس کی آخری تصویر بڑی رومان انگیز تھی۔

سرویا کی شادی ہو گئی تھی۔

برات گاؤں واپس آ گئی تھی لیکن اب تک وہ اپنی بیوی کی ایک بھی جھلک نہ دیکھ سکا تھا۔ اُس کا باپ براتیوں کی خاطر کر رہا تھا اور انہیں دارو بھی پلا رہا تھا۔ برسات کا موسم تھا۔ بڑا حبس ہو رہا تھا۔ ہوا کا ایک جھونکا بھی نہیں تھا کہیں۔ گاؤں کی عورتوں نے اُس کی بیوی کو گھیر رکھا تھا اور وہ پسینے سے پوری طرح بھیگ رہی تھی۔ وہ خود بھی چھت پر بیٹھا اپنے دوستوں سے گپ شپ کر رہا تھا لیکن دھیان اُس کا اپنی بیوی کی طرف ہی تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کب سب لوگ اپنے اپنے گھر جائیں اور کب وہ اپنی بیوی کا گھونگھٹ اٹھائے۔

کہیں آدھی رات کے سمے سب کھانا کھا کر فارغ ہوئے۔ اُس نے بھی اپنے دو تین دوستوں کے ساتھ پوریاں کھائیں اور پھر اُس کے دوست اپنے اپنے گھر چلے گئے۔

ہوا ایکدم بند تھی۔ شاید بارش ہو جائے رات کو۔
سروپا کھاٹ پر پڑا تھا اور بے حد تھکان کے کارن اونگھ گیا تھا۔
اس کی ماں چھت پر آئی تھی۔
"نیچے چل سروپے۔ انارو کو تو دیکھ لے۔"
وہ چونک پڑا اور کھاٹ پر اٹھکر بیٹھ گیا۔
پھر اپنی ماں کے ساتھ بانس کی سیڑھی پر پاؤں دھرتا نیچے اتر گیا۔
وہ بہت حیران ہوا جب اس کی ماں نے اسے گھٹن بھرے کمرے کے اندر دھکیل اور باہر سے سانکل لگا دی۔
اس نے دیکھا دیئے کی مدھم روشنی میں انارو ایک گٹھری کی طرح کھاٹ پر پڑی تھی۔
اس لال رنگ کی گٹھری کو دیکھتے ہی اس کا یہ احساس ختم ہو گیا کہ کمرے میں گرمی تھی اور روشنی بھی صرف نام کو ہی تھی۔
اس نے کھاٹ کے پاس کھڑے ہو کر کہا۔
"انارو میں ہوں سروپا"
شاید اس نے خواب میں یہ جملہ زرا زور سے کہہ دیا تھا۔ جھلنگا کھاٹ پر پڑے نیند کی کیفیت میں خواب دیکھتے ہوئے اسی کھشن انارو داخل ہوئی تھی گھر کے اندر۔
اس نے شاید سروپے کے منہ سے خواب میں اونچی آواز میں نکلا اپنا نام سن لیا تھا۔
"کے بات سے گجری کے بابو۔" وہ بولی
"کچھ نہیں۔ جرا آنکھ لگ گئی تھی۔" وہ گھبرا کر کھاٹ سے اٹھ بیٹھا۔
ماضی کی تصویروں کی ساری تفصیلات ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔
اسے کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں تھا اور کیا سوچ رہا تھا۔ اور خواب کی کون سی منزل پر تھا۔
انارو سروپے کی پائینتی بیٹھ گئی۔ دونوں کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔

اُس رات بہت برسوں کے بعد، آنگن میں دو کھاٹیں ساتھ ساتھ بچھی تھیں۔
ایک کھاٹ پر سروپا پڑا تھا' دُوسری پر انارو۔
دونوں کروٹ لے کر اپنی اپنی کھاٹوں کی پٹیوں پر ہو گئے تھے اور دھیرے دھیرے باتیں کر رہے تھے۔ دونوں کو یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس سے پہلے وہ کب ایک دُوسرے کے ساتھ اِس طرح سٹ کر سوئے تھے اور کب اُنہوں نے اس سکون سے ایک دُوسرے سے باتیں کی تھیں۔
اُس ایک کھشن کو یاد کرتے ہوئے دونوں کی آنکھ لگ گئی۔
چھٹی کا چاند آکاش میں دھیرے دھیرے سرکتے ہُوئے اِن دُکھ اور درد کے مارے پرانیوں کو دیکھ رہا تھا جن کی تقدیر میں یہ کھشن ایک اشیرواد بن کر آیا تھا۔ اور کچھ دیر کے لئے وہیں ٹک گیا تھا۔
زندگی میں کبھی کبھی کُچھ کھشن ایک ہی جگہ رُک بھی جاتے ہیں اور سالوں اور صدیوں میں بدل جاتے ہیں۔ دراصل یہی وہ کھشن ہیں جن پر انسانی زندگیوں کی اور سماج کی اور سبھیتاؤں کی مضبوط بنیادیں رکھی جاتی ہیں جن کو درشانے کے لئے اتہاس لکھے جاتے ہیں اور ویدوں اور اُپنشدوں کی رچنا کی جاتی ہے۔
عجیب اتفاق کی بات ہُوئی تھی اُس دِن۔
ریواڑی کے گاؤں کا ٹھُو واس سے چودھری آیا رام سروپے کے گھر آیا تھا۔ اُسی دِن دوپہر کو کالی چرن کا خط بھی آیا تھا اور منی آرڈر بھی۔
سروپے نے منی آرڈر فارم پر انگوٹھا لگا کر روپے تو ڈاکیئے سے لے لئے تھے لیکن کالی چرن کا خط اُس نے بعد میں پڑھوایا تھا جب چودھری آیا رام جا چکا تھا۔
آیا رام اپنی بیٹی انگوری کا رشتہ لے کر آیا تھا سروپے کے گھر۔
انارو ابھی ابھی اہیروں کے گھر سے لسی لے کر لوٹی تھی اور لسی کو چاٹی میں ڈال کر سروپے کے لئے دو روٹیاں سیکنے لگی تھی۔ چولھے میں بہت دُھواں تھا' جس سے اُس کی آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے اور وہ بار بار کھانس بھی رہی تھی۔

سروپا کھاٹ پر بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔
کسی نے باہر کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔ سروپا حقہ ایک طرف سرکا کر کھاٹ سے اُٹھا اور اُس نے دروازہ کھولا۔ سامنے ایک اجنبی آدمی کھڑا تھا۔
"میرا نام آیارام ہے۔ میں کاٹھوواس سے آیا ہوں۔"
"تو اندر آجاؤ بھائی۔" سروپے نے کہا۔
سروپا آیارام کو اندر لے آیا اور اُسے کھاٹ پر بٹھا دیا۔ انارو جو چولھے کے پاس بیٹھی بدحال ہو رہی تھی، اُٹھی اور اپنی اوڑھنی سنبھالتی ہوئی اندر چلی گئی۔ چولھے سے نکلتا دھواں اور بھی زیادہ ہو گیا۔
سروپے نے خود ہی گلاس میں گھڑے سے پانی ڈالا اور آیارام کو پیش کیا۔
آیارام نے پانی پی کر، کاندھے پر ڈالے انگوچھے سے مُنہ صاف کیا اور بولا۔
"کالی چرن کا کوئی خط آیا ہے؟"
"نہیں۔ آپ کیسے جانو ہو کالی چرن کو؟"
"میرا بیٹا جمنا اور کالی چرن دوست ہیں۔"
"آپ کا بیٹا بھی فوج میں ہے؟"
"ہے بھئی، ہاں!"
"یہ تو گھنی اچھی بات ہے۔" سروپے نے مسکرا کر کہا۔
اس کی بات سُن کر آیارام بھی مسکرایا۔
"میں اپنی بیٹی کا رِشتہ لے کر آیا ہوں؟"
"کالی چرن کے لئے؟"
"ہاں چودھری۔"
سروپے نے انارو کو آواز دی۔
انارو اپنی اوڑھنی سنبھالتی ہوئی باہر آنگن میں آ گئی۔
"چودھری آیارام کاٹھوواس سے کالی چرن کے لئے اپنی بیٹی کا رِشتہ لے کر

آئے ان کا بیٹا اور کالی چرن ایک ہی پلٹن میں ۔
انارو نے مسکرا کر چودھری آیا رام کا سواگت کیا اور آنگن میں پڑے ایک پرانے مونڈھے پر بیٹھ گئی۔
اہیروں کے گھر سے لائی ہوئی لسی اور دھواں اگلتے ہوئے چولہے پر سینکی روٹیاں آم کے اچار کے ساتھ سروپے اور آیا رام دونوں نے کھائیں۔ اس کے بعد پھر بات چیت ہوئی۔ آیا رام نے اپنے اور خاندان کے بارے میں ضروری تفصیل بتائی۔ اس کی تین بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔ دو بیٹیوں کی شادی ہو چکی تھی۔ انگوری تیسری بیٹی تھی، جو پانچویں پاس تھی اور سب سے چھوٹی تھی۔ اس کے بھائی جمنا نے ہی کالی چرن کو پسند کیا تھا اور آیا رام کو لکھا تھا کہ بیرلی جاکر کالی چرن کے پتا سے بات پکی کر لی۔ اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ کالی چرن راضی تھا اور اس نے اس بارے میں اپنے پتا کو لکھ بھی دیا تھا اور یہ بھی لکھا تھا کہ وہ اور کالی چرن اگلے مہینے چھٹی پر آرہے تھے اور جبھی وہ انگوری کے بیاہ کی تاریخ نکلوائیں گے۔
"تیرا کے کھیاں سے چودھرن؟" سروپے نے انارو سے سوال کیا تھا۔
"مجھے تو چھوری کا نام پسند ہے۔" انارو نے اپنے چہرے کو اوڑھنی سے ڈھانپتے ہوئے کہا۔
"انارو اور انگوری، جوڑی تو اچھی ہے۔" سروپے نے مسکرا کر کہا۔
"انار اور انگور اچھے پھل بھی تو ہیں۔" آیا رام نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔
"کالی چرن کا کھط آئے تو بات پکی کرلیں گے۔" انارو بولی۔
"جیسی تمھاری مرجی چودھرن۔" آیا رام نے جواب دیا۔
"میں کھط لکھوا دوں گا۔" سروپے نے کہا۔
آیا رام کی تسلی ہو گئی۔ دوپہر کے بعد وہ اپنے گاؤں کاٹھو واپس چلا گیا۔
آیا رام کے جانے کے بعد ہی کالی چرن کا خط بھی آگیا تھا۔ خط کو سروپے نے خود ہی پڑھوایا تھا۔ کالی چرن نے وہی کچھ لکھا تھا جس کا ذکر آیا رام نے کیا تھا۔ وہ اگلے

مہینے چھٹی بھی آرہا تھا۔ انارو کی بھی تسلی ہوگئی تھی۔ اُس نے اپنے گھر والے کو یہی صلاح دی کہ وہ اُس سے اگلے دن ہی آیا رام کو خط لکھ دے اور رشتے کی بات پکی کر دے۔

اگلے ہی دن سروپے نے خط لکھوا کر کالی چرن اور انگوری کے رشتے کی بات پکّی کر دی۔

وعدے کے مطابق دونوں دوست چھٹی پر آ گئے تھے۔

جمنا بھی اور کالی چرن بھی۔

دونوں نے سفر بھی اکھٹے ہی طے کیا تھا۔ ریواڑی ریلوے اسٹیشن تک دونوں ساتھ تھے۔ جمنا ریواڑی سے کاٹھوواس چلا گیا اور کالی چرن اپنے گاؤں بیرلی کے لئے روانہ ہوگیا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ سات دن کے بعد جمنا کالی چرن سے ملنے بیرلی آئے گا اور وہیں بیاہ کی تاریخ اور برات کے بارے میں تفصیل سے بات کریں گے۔

کالی چرن نے تو ایک طرح سے بیاہ کی تیاری کر لی تھی۔ کپڑے لتّے وہ خرید لایا تھا۔ اپنے لئے، اپنے باپ سروپے کے لئے اور اپنی ماں انارو کے لئے۔ کچھ کپڑے تو وہ جمنا کے مشورے کے مطابق انگوری کے لئے بھی خرید لا تھا۔ دونوں دوستوں میں بہت سی باتوں کے بارے میں ایک رائے تھی۔ اس لئے اختلافات کی گنجائش نہیں تھی۔

سروپا اور انارو بہت خوش تھے۔ اُن کا بیٹا تو بڑا سمجھدار تھا۔ اُس نے تو کرنے کے لئے کچھ چھوڑا ہی نہیں تھا۔ صرف گہنوں کی بات تھی۔ کالی چرن تو سونے کے دو ایک زیور بھی لے آیا تھا۔ کچھ گہنے انارو بھی دینے پر راضی ہوگئی تھی۔

ایک دن بات جہیز کی ہو رہی تھی۔

"لڑکی والے کے دیویں گے؟" سروپے نے کالی چرن سے پوچھا۔

"لڑکی والے تو بس لڑکی ہی دیویں گے؟"

"ٹوسب، کپڑا، پلنگ، کرسی، کچھ تو بنتا ہے، اُن کا دینا۔"

"کچھ نہیں بنتا۔ میں نے کچھ بھی لینے سے انکار کر دیا ہے۔"

"کیوں؟"

"جہیز لینا بڑا غلط رواج ہے۔"

"گلط کیوں سے؟"

"چاچا، وہ جو پانچ ہزار قرض لئے تھے تُم نے، گجری کی شادی پر، اُن میں سے کچھ لوٹا پائے ہو؟"

"نہیں۔"

"اگر جہیز کی غلط پرتھا نہ ہوتی تو ہمارا گھر اس طرح کیوں برباد ہوتا۔"

"کالی چرن ٹھیک کہوے سے۔" انارو جو باپ بیٹے کی بات چیت چپ چاپ سُن رہی تھی۔ اب بولے بنا نہ رہ سکی۔

"اگر جہیز دینے کے لئے تُم نے لالہ کے پاس اپنا کھیت رہن نہ رکھا ہوتا تو آج ہم بھی گاؤں میں سر اُونچا کر کے چلتے۔ لالہ نے تو اب تک اپنے بہی کھاتے میں ہمارا کھیت ہتھیا بھی لیا ہوگا۔"

"جرُور ہتھیا لیا سے۔" انارو بولی

"تُم سمجھتی ہو جہیز کی پرتھا ٹھیک ہے۔"

"نہیں۔"

"تو میں نے جہیز لینے سے انکار کر کے کوئی غلط بات تو نہیں کی۔"

"بالکل نہیں۔ میں تو اب سارے گام (گاؤں) میں دہیز کے کھلاف بولوں گی۔"

"تھارا دماگ کھراب ہو رہیا سے۔" سرُوپے نے غصے سے کہا۔

"نہیں چاچا، ایسا نہیں ہے۔ ماں ٹھیک کہہ رہی ہے۔"

"سُسری نیتا گری کرے گی اب۔" سرُوپا بولا۔

"میں تو کروں گی نیتا گری۔ کالی چرن دہیز نہیں لیوے گا۔"

"تو کنویں میں گرو۔ مجھے کیا۔"

سرُوپا اپنی بات کہہ کر اُٹھ گیا۔ انارو اور کالی چرن میں گفتگو ہوتی رہی۔ ماں بیٹا، دونوں ہی اس بات پر سہمت تھے کہ بیاہ میں جہیز نہیں لیا جائے گا۔

اگلے دن کاٹھوواس سے جمنا آگیا۔

اُس کے آنے سے کالی چرن بے حد خوش تھا۔ خوش تو خیر سروپا اور اناروبھی تھے لیکن کالی چرن کا تو جمنا جگری دوست تھا۔ لیکن اُس کے ماں باپ کے لئے تو وہ مہمان تھا۔ وہ اُسکے ساتھ مہمانوں جیسا سلُوک ہی کر رہے تھے۔ جمنا کو سنکوچ بھی ہو رہا تھا۔

بیاہ کی تاریخ طے ہو گئی۔

برات کا بھی فیصلہ ہو گیا۔ برات میں صرف سات آدمی ہوں گے۔

"کچھ سنکھیا تو بڑھا لو۔" جمنا بولا۔

"سات ٹھیک نہیں کیا؟ براتی تو ایک بھی بہت ہوتا ہے۔" کالی چرن نے جواب دیا۔

جمنا مان گیا۔

جہیز کی بات ہوئی تو جمنا نے کہا۔

"میرے گھر والوں نے تو دہیز کا انتظام کر رکھا ہے۔ ہمارے ہاں جس دن لڑکی پیدا ہوتی ہے، اُس کی ماں اُسی دن دہیز کا جوگاڑ کرنا شروع کر دیتی ہے۔"

"تمہیں معلوم ہے، میں نے دہیز نہ لینے کا پرن لے رکھا ہے۔"

"معلوم ہے۔ تو ہم کیا کریں گے دہیز کا؟"

"تمہارے بیاہ میں کام آئے گا۔" یہ کہہ کر کالی چرن نے زور کا قہقہہ لگایا۔

بات یہیں ختم ہو گئی۔

رات کو دونوں نے تھوڑی دارو پی لی اور پھر کھانا کھا کر چھت پر سو گئے۔

اگلے دن جمنا کاٹھوواس واپس چلا گیا۔

تین دن کے بعد کالی چرن اپنی بہن گجری کو اُس کی سُسرال سے لے آیا۔ سُورج بھی آگیا تھا۔ سُورج اب تک بھی سکُول کی کسی کلاس سے چھُٹی پر آیا طالب علم ہی لگتا تھا۔ پر تھا وہ بڑا معصوم اور بے عیب۔ گجری اپنی سُسرال میں بہت خوش تھی۔ سُورج

اتنا شریف اور اچھا تھا کہ گجری کے اپنے مائیکے آنے کے بعد وہ اُس سے بہت ہی کم بات کرتا تھا۔ رات کو وہ سوتا بھی کالی چرن کے پاس ہی تھا۔ گجری کے آنے سے گھر میں رونق ہو گئی تھی۔ اُس کی سہیلیاں بھی اُس سے ملنے آجاتی تھیں اور شادی کی تیاریوں میں اُس کا ہاتھ بٹاتی تھیں۔ رات کو وہ اکٹھی ہو کر ڈھولک پر گیت گاتی تھیں تو کالی چرن کو بہت اچھا لگتا تھا۔ ایک دن تو بلکہ اُس نے گجری سے ایک گیت کی فرمائش بھی کی تھی۔ وہ گیت اُسے بہت اچھا لگتا تھا۔

جب تک آس پاس کے گھروں کی لڑکیاں وہ گیت گاتی رہیں کالی چرن اپنی کھاٹ پر پڑا پڑا آنند لیتا رہا۔

لاڈو اے باگاں کا جانا چھوڑ دو، آ رہے ہیں تمہارے کھبر تاریاں
ہو رہے ہیں گھوڑے پہ سواریاں، لے رہے ہیں ڈھال تلواریاں
لاڈو اے کوئے کا جانا چھوڑ دو، آ رہے ہیں تمہارے کھبر تاریاں
ہو رہے ہیں گھوڑے پہ سواریاں، لے رہے ہیں ڈھال تلواریاں
لاڈو اے گلیاں کا جانا چھوڑ دو، آ رہے ہیں تمہارے کھبر تاریاں
ہو رہے ہیں گھوڑے پہ سواریاں، لے رہے ہیں ڈھال تلواریاں

بارات منی بس میں کاٹھوواس گئی تھی۔

جس میں صرف سات لوگ تھے۔ اُن میں کالی چرن کی بہن گجری تھی اور اُس کی ایک سہیلی امرتی تھی۔ باقی سب مرد تھے۔ سروپا اُس دن بڑی موج میں تھا۔ کالی چرن کی لائی ہوئی رم بس اُسی کے کام آ رہی تھی۔ وہ صبح ہی سے اندر باہر جاتے ہوئے ایک آدھ لگا لیتا تھا۔ اُس کے سر پہ گلابی رنگ کی پگڑی سج بھی بہت رہی تھی، جب بارات کاٹھوواس پہونچی تو شام ہونے کو تھی۔ جمنا اور اُس کے پتا آیا رام نے بارات کا استقبال کیا۔ گاؤں کے چوپال ہی میں اُن کے ٹھہرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ جمنا نے کالی چرن کو اپنی بانہوں میں لیتے ہوئے کہا تھا۔

"اگر کبھی ہمیں کسی فرنٹ پر بھی جانا پڑا تو ایسے ہی گلے مل کر جائیں گے۔"
"ایسا ہی کریں گے جمنا۔" کالی چرن نے کہا تھا۔
گجری اور اُس کی سہیلی امرتی دونوں کو جمنا اپنے گھر لے گیا۔ راستے میں اُس نے مذاق میں کہا۔
"گجری اگر تمہارا بیاہ نہ ہُوا ہوتا تو میں تمہیں سے شادی کرتا۔"
گجری نے جھینپ کر نظریں جھکالیں اور اُس کی سہیلی امرتی نے زور کا قہقہہ لگایا۔
کوئی آڈمبر نہیں تھا۔
شادی بہت سادہ ڈھنگ سے ہوئی تھی۔ جب تک بارات نے کھانا کھایا' پھیرے بھی ہو گئے۔ اور کالی چرن نے انگوری کی ایک جھلک بھی دیکھ لی۔ اس سے پہلے تو اُس نے انگوری کو دیکھا بھی نہیں تھا۔ وہ اُس کے دوست جمنا کی بہن تھی' کالی چرن کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔
جس منی بس سے بارات گئی تھی اُسی سے واپس آگئی۔ صرف ایک جنے کی بڑھوتی ہوئی تھی۔
انگوری کی۔
انگوری اور گجری اور امرتی تینوں سٹ کر بیٹھی رہیں اور تمام راستے آپس میں کھسر پھسر کرتی رہیں۔ کسی کو معلوم نہیں ہُوا کہ اُن تینوں میں اتنی دیر کیا باتیں ہو رہی تھیں۔
پہلے ہی دن کالی چرن نے انگوری کو اپنے گھر کے تمام حالات سے آگاہ کر دیا۔ اور اُسے کہا کہ اُس کے بھائی جمنا کی اور اُس کی مجبوریاں ایک جیسی تھیں۔ انہیں تو اکثر گھر سے باہر ہی رہنا پڑے گا کیوں کہ مُلک کی حفاظت اپنے بڑے سے بڑے ذاتی مسئلے سے زیادہ ضروری تھی اور وہ اپنے قومی فرض کی ادائیگی میں کسی بھی حالت میں سمجھوتہ نہیں کر سکیں گے۔
اس لئے گھر کی سالمیت اور امن چین کی ذمہ داری اُس پر تھی۔

گجری تو دو چار روز کے بعد چلی جائے گی اور گھر میں صرف اُس کی ماں انارو اور باپ سروپا ہی رہ جائیں گے۔ انارو کے خیالات بہت صاف سُتھرے تھے اِس لئے اُس کی طرف سے کبھی کسی غلط فہمی کی سمجھاؤنا نہیں تھی۔ سروپا بڑا سیدھا سادا آدمی تھا۔ اُسے صرف پینے کی لت تھی اور وہ اُسے جلدی چھوڑے گا کبھی نہیں۔

"تمہیں تو کہیں کتھاواچک بن جانا چاہئے" انگوری نے اتنا بڑا لیکچر سُننے کے بعد کالی چرن سے کہا۔

کالی چرن اُس کی بات سُن کر ہنس دیا اور بولا۔

"جمنا کبھی تو کم کتھاواچک نہیں"

"اُس کے وِیاکھیان کبھی تو سُنتی آئی ہوں"

"تمہیں وِیاکھیان پسند نہیں؟"

"کچھ زیادہ پسند نہیں لیکن ایک بات ہے۔ جب تم دونوں کی فوج کی نوکری چھوٹے گی تو تمہیں روزی روٹی کی فکر نہیں ہوگی۔ کتھاواچک بن کر گذارہ چلا لو گے۔"

کالی چرن بہت زور سے ہنسا اور اسی طرح ہنستے ہوئے اُس نے انگوری کو اپنے بازوؤں میں لے کر اُسے چوم لیا۔

"تمہارے ماں باپ نے تمہارا نام بڑا چُن کر رکھا ہے۔ تمہارے ہونٹوں میں سچ مُچ پکّے انگوروں کا رس گُھلا ہے"۔

انگوری بولی کچھ نہیں۔ صرف آہستہ سے اپنے آپ کو کالی چرن کے بازوؤں سے الگ کر لیا۔

سُورج دو دِن کے بعد چلا گیا۔ اُس نے گجری کو ساتھ لے جانے کی ضد نہیں کی۔ گجری اس بھرے پُرے گھر میں انگوری کے ساتھ بہت خوش تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے بے حد پیار کرنے لگی تھیں۔

کچھ روز کے بعد سیاپر بسے اِن بچھڑے ہوئے لوگوں کے گھروں میں سے ایک گھر میں بارات آنے والی تھی۔

لڑکے کا باپ اور ماموں لڑکی والوں کے گھر آئے تھے۔ معاملہ جہیز پر آکر اٹک گیا تھا۔ لڑکے والے جتنا جہیز مانگتے تھے وہ لڑکی کے باپ کی توفیق سے باہر تھا۔ آپس میں کافی بحث ہوتی رہی۔ اِس کی بھنک انارو کے کان میں بھی پڑ گئی۔ وہ فوراً اپنے پڑوسی کے گھر میں پہونچ گئی۔ اُس نے لڑکے کے باپ اور ماموں سے صاف صاف کہہ دیا کہ جہیز کے نام پر اُنہیں اِن گھروں میں سے کچھ نہیں ملے گا۔

"اگر ہمیں جہیز نہیں ملا تو بارات واپس چلی جائے گی۔" لڑکے کے ماموں نے کہا جو شہر کا رہنے والا لگتا تھا۔

"بارات لاؤ گے ہی کیوں؟"

"لیکن یہ ہمارا اپنا معاملہ ہے۔ آپ کیوں دخل دے رہی ہیں؟"

"اِس گام میں کوئی مامِلہ نجی نہیں سے۔ سارے مامِلے گام کے مامِلے سیں۔"

یا تو دہیز کے بِنا ساد ی کرو۔ نہیں تو بارات لاؤہی مت۔"

بہت بحث مباحثے کے بعد لڑکے کا ماموں مان گیا۔

بیرلی گاؤں میں بنا جہیز کے یہ دوسری شادی تھی۔ پہلی شادی کالی چرن کی تھی۔ سیما پر بسے اِن پچھڑے ہوئے لوگوں نے ایک اور مثال قائم کر دی تھی۔

انارو آپ سے آپ اپنے ورگ کی نیتا بن گئی تھی۔

اِن گھروں میں جب بھی کوئی جھگڑا ہوتا انارو ہی ثالث ہوتی اور دونوں فریق اُس کے فیصلے کو مان لیتے۔

جب چھُٹی کے بعد کالی چرن واپس گیا تو اُس کے ساتھ جمنا بھی تھا۔

انگوری کاٹھگو واپس گئی تھی کالی چرن کے ساتھ اور اُس نے رلیواڑی ریلوے سٹیشن پر دونوں کو وداع کیا تھا۔

گاڑی کے چلے جانے کے بعد انگوری اپنے پتا آیا رام کے ساتھ کافی دیر پلیٹ فارم پر پڑے بینچ پر بیٹھی رہی اور اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگتی رہیں۔

انگوری چار دِن کاٹھگو واپس میں رہی اور پھر اُس کا پِتا آیا رام اُسے بیرلی چھوڑ گیا۔

بیاہ کے بعد لڑکی کا گھر وہ ہوتا ہے جہاں اُس کی سُسرال کے لوگ رہتے ہیں۔ اپنے مائیکے سے تو اُس کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔

گجری کو تو کئی دِن پہلے اُس کا خاوند سُورج ساتھ لے گیا تھا۔

اب تو گھر میں انارو تھی اور انگوری تھی اور سروپا تھا۔ سروپا تو بڑا بے نیاز قسم کا آدمی تھا وہ گھر میں ہوتا ہی کہاں تھا۔ انارو اور انگوری آپس میں اس طرح گھُل مِل گئیں جس طرح انار اور انگور کا رس آپس میں تحلیل ہو کر اپنی اپنی ذاتی پہچان کھو دیتا ہے اور اپنے لئے ایک نئی قسم کی خوبصورت پہچان بنا لیتا ہے۔ انارو اور انگوری کا آپسی رشتہ گاؤں بھر کے لئے ایک مثال کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ اِن دونوں کی آواز کو اب سارا گاؤں پہچاننے لگا تھا۔

جہیز لینے اور دینے کی بُرائی پرتھا بیرلی گاؤں میں ختم ہو گئی تھی۔ عورتوں کا ایک پُورا طاقتور گروپ بن گیا تھا۔ اب یہاں کا کوئی چھورا جہیز نہیں لیتا تھا اور یہاں کی کسی چھوری کو اُس کے ماں باپ جہیز نہیں دیتے تھے۔

یہ ایک بہت بڑا انقلاب تھا، جسے انارو نے اپنی بہو انگوری کے تعاون سے مُکمل کیا تھا۔ انگوری گاؤں کی بہو ہوتے ہُوئے بھی پردہ نہیں کرتی تھی۔ البتہ انارو اپنے بڑے بزرگوں سے، اُن کی عزت کی خاطر، چہرے پر اوڑھنی کھینچ لیتی تھی۔

اِسی دوران گاؤں میں ایک اور گھٹنا ہو گئی۔

ہریانہ کے سیما پر بسے ہُوئے اِن گاؤں میں شراب پینے کی عادت اِس لئے بھی زیادہ تھی کیوں کہ ساتھ لگتے راجستھان کے گاؤں میں لوگ بہت شراب پیتے تھے۔ اِن گاؤں کے لوگوں کا اِدھر اُدھر آنا جانا بھی رہتا تھا اور آپس میں اُن کی رشتہ داریاں بھی تھیں۔ رسم و رواج بھی لگ بھگ ایک جیسے تھے۔ اِس لئے سماجی زندگی گذارنے کا اثر ایک دُوسرے پر پڑنا ضروری تھا۔ سب سے بڑا اثر شراب نوشی کا تھا۔ اِس کا چلن پچھڑی جاتیوں کے لوگوں پر کُچھ زیادہ ہی تھا۔

انارو کے گھر سے پانچ گھر دُور کے گھر میں رات کو اکثر جھگڑا ہوتا رہتا تھا اس سے

پہلے انارو کی کوئی سماجی حیثیت نہیں تھی، اس لئے اُس نے کبھی دخل نہیں دیا تھا۔ ہوتا یہ تھا کہ مرد ہر رات کو گھٹیا قسم کی شراب پی کر آتا تھا اور اپنی لُگائی سے گالی گلوچ بھی کرتا تھا اور اُسے پیٹتا بھی تھا۔ کیوں کہ آس پڑوس کے سبھی گھروں کے مرد ایسا ہی کرتے تھے اس لئے کوئی کسی کو ٹوکتا نہیں تھا۔ خود انارو کا مرد سُروپا بھی تو شراب پیتا تھا۔ لیکن اس میں ایک اچھی عادت یہ تھی کہ وہ شراب پی کر ہلّہ گلّہ نہیں کرتا تھا۔ وہ آکر کھاٹ پر پڑ جاتا تھا اور کسی سے کچھ کہنا سُننا نہیں تھا۔ رات کو اُسے جب بھوک لگتی، تو خود ہی اُٹھ کر ٹھنڈی چپاتیاں اچار کے ساتھ کھا لیتا اور گھڑے کا ٹھنڈا پانی پی کر سو جاتا۔ اس لئے انارو کے گھر میں دُوسرے گھروں کی طرح جھگڑا نہیں ہوتا تھا۔ انارو اپنے گھر والے کو ٹوکتی تو رہتی تھی لیکن اُس سے جھگڑا نہیں کرتی تھی۔

رات بہت ہو گئی تھی۔

سارا گاؤں سو رہا تھا۔ کہیں کوئی آواز نہیں تھی۔ اِکّا دُکّا کُتّے ضرور بھونک رہے تھے۔ انارو اور اُس کی بہو انگوری دونوں سو رہی تھیں۔

سُروپے کے شراب پینے کا روبار اسی لئے چل رہا تھا کہ وہ شراب پی کر بہکتا نہیں تھا اور کسی سے جھگڑا نہیں کرتا تھا۔ نہیں تو سستی شراب پینے والوں کی ایک بُری عادت یہ بھی ہے کہ اگر وہ ذرا سی زیادہ پی لیں تو اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں۔ انہیں اپنی اوقات یاد ہی نہیں رہتی۔ کبھی کبھی تو بنا کسی بات کے جھگڑا مول لے لیتے ہیں جس کا انہیں نتیجہ بعد میں بھگتنا بھی پڑتا ہے۔ حالانکہ انارو اُسے شراب پینے سے ٹوکتی رہتی تھی لیکن اُس سے کُھلے عام جھگڑا نہیں کرتی تھی۔ اسی لئے گلی محلّے کے لوگ حیران ہوتے تھے کہ سُروپے کے گھر میں جھگڑا کیوں نہیں ہوتا تھا۔

سُروپے میں ایک اچھی عادت یہ بھی تھی کہ جب وہ زیادہ شراب پی لیتا تو وہ زیادہ گہری نیند سوتا تھا اور اِرد گرد کے ماحول سے کٹ جاتا تھا اور اپنے کھاٹ پر بے سُدھ پڑا خرّاٹے لیتا رہتا تھا۔

اچانک اونچی اونچی آوازیں آنے لگیں پانچ گھر دُور کے گھر سے۔ انارو کی نیند ٹوٹ گئی۔ دھنو زور زور سے چیخ رہی تھی۔ انارو کو لگا جیسے دھنو اپنے گھر کے آنگن سے نہیں بلکہ گلی میں سے چیخ رہی تھی۔ کچھ گھنٹوں کے بعد انارو کو یوں لگا کہ دھنو اس کے بند دروازے کے باہر کھڑی چلّا رہی تھی۔ سروپا تو گہری نیند سو رہا تھا۔ اسے تو خبر نہ ہُوئی۔ جب انارو دروازہ کھولنے کو اُٹھی تو انگوری بھی کھاٹ سے اُٹھ کر اس کے ساتھ ہولی۔

دروازے کے باہر دھنو کھڑی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہُوئے تھے۔ اوڑھنی اس کے سر پر نہیں تھی۔ اس کے گھر والے نے آج زیادہ پی رکھی تھی اور نشے کی حالت میں اس نے پہلے تو دھنو کو گندی گندی گالیاں دیں اور پھر اسے بُری طرح پیٹا اور جب دھنو نے اس کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی تو اُس نے دھنو کو بالوں سے پکڑ کر گلی میں دھکیل دیا اور اسے گھر سے باہر نکالنے کے بعد گھر کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

"بہت جُلم کیا ہے انارو، میرے گھر والے نے۔"

"آپ اندر آجاؤ، موسی۔" انگوری نے دھنو سے کہا۔

"اندر نہیں آؤں گی۔ تم باہر آجاؤ۔"

آدھی رات کے سمے انارو اور انگوری باہر گلی میں آگئیں۔ دھنو بے حال ہو رہی تھی۔

"میں کروں ہُوں تیرے گھر والے کا علاج۔ تو آ میرے ساتھ۔"

انارو نے دھنو کو بازو سے پکڑ کر ساتھ کر لیا۔

"تُو بھی آجا انگوری۔"

انارو کے کہنے پر انگوری بھی ساتھ ہولی۔

انارو نے سب گھروں کے دروازے زور زور سے کھٹکھٹانے شروع کیے۔

"جاگو بہنو، جُلم ہو رہیا ہے۔"

انارو کی آواز سُن کر عورتیں گلی میں اکٹھی ہونے لگیں۔ تھوڑی دیر میں گھروں کے مرد بھی باہر آگئے۔ سرُوپا بھی جاگ گیا تھا اور اپنے گھر سے نکل کر گلی میں آگیا تھا۔

انارو اندھیری گلی میں عورتوں سے کہہ رہی تھی۔

"دیکھو دھنو کے مَرد نے اس پر کے ظُلم کیا ہے ۔"

انگوری گھر سے نکلتے وقت کالی چرن کی دی ہُوئی ٹارچ بھی ساتھ لے آئی تھی ۔ اُس نے ٹارچ جلائی ۔ دھنو گلی کی اَن پڑھ اور پچھڑے ورگ کی عورتوں کے درمیان کھڑی تھی ۔ اُس کے تو کپڑے بھی پھٹ رہے تھے ۔

"سرم کرو، سرم کرو ۔ دیکھو کے ہو رہیا ہے تھارے پڑوس میں ۔" انارو زور زور سے چلاّئی ۔ گلی میں جمع مرد ایک طرف کھڑے تھے ۔ کسی کی ہمّت نہیں تھی کہ مُنہ سے کچھ بولے ۔

انارو نے سب عورتوں کو ساتھ لے کر دھنو کے گھر پر جیسے دھاوا بول دیا ۔ بڑی زور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا اُس نے ۔

"باہر تو نکل، لُگائی کے سُورمے ۔" انارو چیخ رہی تھی ۔

"کُن سے تُو ؟" وہ اندر سے بولا

"تھاری موت ۔"

دھنو کے گھر والے نے لاٹھی ہاتھ میں لی اور دروازہ کھول دیا ۔ لیکن اتنی ساری عورتوں کو دیکھ کر وہ ڈر گیا ۔

گلی کے سارے مرد گھروں کی دیواروں کے ساتھ خاموش کھڑے تھے ۔ کوئی اُس کے ساتھ نہیں تھا ۔ وہ ایکدم اکیلا تھا ۔ لاٹھی بھی اس کی حفاظت نہیں کر رہی تھی ۔ انارو آگے بڑھ کر اسے باہر گلی میں کھینچ لائی، اور دیکھتے ہی دیکھتے محلے کی ساری عورتیں اُس پر ٹوٹ پڑیں ۔

ٹارچ کی روشنی میں سب نے دیکھا کہ دھنو کا گھر والا اُس سے معافی مانگ رہا تھا ۔

گلی کے مَرد سَر جُھکائے اپنے اپنے گھروں کی طرف چلے گئے ۔ تھوڑی دیر میں عورتیں بھی اپنے گھروں کو لوٹ گئیں ۔

عورتوں کا ایک اچھا مورچہ بن گیا تھا ۔

بیرلی گاؤں کے لیے یہ ایک نئی بات تھی ۔

تھوڑے ہی دنوں میں یہ خبر آس پاس کے سبھی گاؤں میں پھیل گئی ۔ انارو اور اُس کی بہو انگوری کے گھر گھر چرچے ہو رہے تھے ۔ اب انارو، انارو چودھرن بن گئی تھی ۔

ہریانہ میں پنچایت کے چناؤ ہو رہے تھے۔
بیرلی گاؤں میں ایک اور نئی گھٹنا ہوئی۔
انارو چودھرن مہلا پنچ چن لی گئی۔ چناؤ پرچار کا کام اس کی بہو انگوری نے کیا تھا۔
پچھڑی جات کے سب مردوں اور عورتوں نے اپنے ووٹ انارو کو ڈالے تھے۔ مردوں کے صرف دو ووٹ اس کے حق میں نہیں پڑے تھے۔
ایک ووٹ دھنو کے گھر والے کا تھا۔
اور دوسرا ووٹ انارو کے گھر والے کا۔
سروپے نے جلن کے کارن اُسے ووٹ نہیں ڈالا تھا۔ اس کی لگائی اس کا مقابلہ کیسے کر سکتی تھی۔ دھنو کے گھر والے نے بدلے کی بھاؤنا سے اس کا ورودھ کیا تھا۔ بیرلی گاؤں میں پہلی بار پچھڑے ہوئے ورگ کی ایک عورت مہلا پنچ چُنی گئی تھی۔ انارو کی تصویر اخباروں میں بھی چھپی تھی۔ جسے اس کی بیٹی گجری اور اس کے داماد سورج نے بھی دیکھا تھا، اور اسے مبارک بھی بھیجی تھی۔ یہ خبر جب انگوری نے کالی چرن کو اور اپنے بھائی جمنا کو خط کے ذریعے دی تو وہ بہت خوش ہوئے اور اس دن انہوں نے اپنے فوجی میس میں اچھے خاصے جشن کا اہتمام کیا۔
ہریانہ کے دیہات میں رہنے والی عورتیں اب جاگ گئی تھیں۔ عورتیں جب جاگ جائیں تو پھر کوئی گہری نیند نہیں سو سکتا۔
سارا سماج جاگ جاتا ہے۔
سارا دیش جاگ جاتا ہے۔
ساری دُنیا جاگ جاتی ہے۔
اور ساتویں آسمان میں گھوک سویا بھگوان بھی جاگ جاتا ہے اور سنسار میں ہوتا انیائے اور چاروں کھونٹ پھیلے جھوٹ کا اندھیرا اُسے نظر آنے لگتا ہے۔
پنچایتوں کے چناؤ کے کچھ ہی مہینے بعد کئی صوبوں کی ودھان سبھاؤں کے چناؤ کا اعلان ہو گیا۔
ان صوبوں میں ہریانہ بھی شامل تھا۔

حکمراں پارٹی کے علاوہ کئی دوسری پارٹیاں بھی چناؤ میدان میں اُتر آئی تھیں۔ سب پارٹیوں نے اپنے اپنے چناؤ مینی فیسٹو، مختلف ڈھنگوں سے عوام تک پہونچائے۔ کئی دنوں تک بڑا دھوم دھڑکا رہا۔ دیہات میں رہنے والے لوگ اَن پڑھ ضرور تھے لیکن ووٹ دینے کے معاملے میں اُن میں اب بڑی جاگرتی آگئی تھی۔ جس پارٹی کا بھی نیتا اُن کے پاس جاتا وہ اُس کی بات دھیان سے سُنتے لیکن اسے اپنے من کی بات نہ بتاتے۔ ادھر دیش بھر میں کروڑوں روپے کے کئی گھُٹالے سامنے آرہے تھے۔ عوام کی سوچ اُلجھ گئی تھی۔ کوئی صاف تصویر ان کے سامنے نہیں تھی۔ وہ کس پارٹی پر اعتبار کریں۔ حمام میں سبھی ننگے نظر آرہے تھے۔ ہر گاؤں میں گُٹ بندی تھی۔ ٹٹ پُونجیے قسم کے نیتا اُبھر آئے تھے۔ کھادی کا کُرتہ پاجامہ پہنے دن بھر گھُومتے رہتے۔ اپنی اپنی ذاتی غرض بھی پوری کرتے اور چناؤ اُمیدواروں کو غلط سلط باتیں بھی بتاتے رہتے۔ ہر پارٹی کے ہر ایک اُمیدوار کو یقین تھا کہ اُس کے حلقے کے لوگ اسے ہی ووٹ ڈالیں گے اور صرف وہی کامیاب ہوگا۔ اُس کے مخالف اُمیدوار کی یا تو ضمانت ضبط ہوگی یا وہ بُری طرح سے ہارے گا۔ چھوٹے موٹے جیوتشیوں کی چاندی ہو رہی تھی۔ اُمیدوار اُن کے چرنوں میں سر بھی جھُکاتے تھے۔ اور انہیں بڑے بڑے چڑھاوے بھی چڑھاتے تھے۔

دعوتیں ہو رہی تھیں، شراب کی بکری خوب بڑھ گئی تھی۔ اپنی اپنی پارٹی کے جھنڈے لہراتیں جیپیں اور منی بسیں گاؤں گاؤں گھُومتیں اور دھول کے گھنے بادل اُڑاتیں اور اُمیدوار جھُوٹے اعلان کرتے اور جھُوٹے وعدوں سے جنتا کا وشواس حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے۔

ہریانہ وکاس پارٹی کے مینی فیسٹو میں ایک اعلان نیا تھا اور اسے زور زور سے دُہرایا جاتا تھا۔ وہ اعلان تھا شراب بندی کا۔ شہروں میں تو اس کا اثر زیادہ نہیں تھا لیکن دیہات میں اس کا پربھاؤ بہت زیادہ تھا۔ عورتیں اس اعلان سے بہت خوش تھیں۔ شراب ہی نے تو ان کے گھر برباد کیے تھے۔ اُن کے گھر والے پیسہ بھی لُٹاتے تھے اور عورتوں کی مار پٹائی بھی کرتے تھے۔ شراب کے کارن ہی اُن کے کھیت بھی بکے تھے، اور ٹُومبیں بھی مٹی کے

مول فروخت ہوئیں تھیں۔ شراب پینے والے مرد دنگا فساد بھی کرتے تھے۔ اور پولس گاؤں میں چھاؤنی ڈال کر پڑی رہتی تھی۔ وہ گاؤں والوں پر جُلم بھی ڈھاتی تھی اور انھیں کنگال بھی کرتی تھی۔

شراب بندی کے اعلان نے دُکھی اور مظلوم عورتوں کو ایک سانجھا مورچہ دے دیا تھا۔ وہ اس محاذ پر اکٹھا ہو کر سماج کے اس دُشمن پر زور دار حملہ کر سکتی تھیں۔ بس انھیں ایک جاندار جرنیل کی ضرورت تھی۔

یہ محاذ جگہ جگہ پر کُھل گئے۔

اور نہتی لیکن پکّے اِرادے کی سپاہی عورتیں صف آرا ہو گئیں۔

ہر ٹکڑی کو ایک ایک جرنیل مِل گیا۔

مہندر گڑھ اور ریواڑی کے ضلعوں میں سیماؤں پر جو فصیلیں تیار کی گئیں اُن کی اگوائی کا کام انارو چودھرن اور اس کی بہو انگوری دیوی کو سونپا گیا۔

گاؤں گاؤں میں عورتوں کی ٹولیاں شراب کے خلاف نعرے لگاتے ہوئے گھومتیں اور شراب کے ٹھیکوں کو بند کرواتیں، جہاں اُنھیں کے گھروں کے مرد گندی گندی کھاٹوں پر اوندھے پڑے ہوتے۔ ان عورتوں میں زیادہ تعداد پچھڑی ہُوئی جاتیوں سے تعلق رکھنے والی عورتوں کی ہوتی۔ دراصل سب سے زیادہ مظلوم اور دُکھی عورتیں یہی تھیں۔

دیسی شراب کے ایسے ہی ایک ٹھیکے کو بند کروانے کے لیے جب عورتوں کی ایک ٹولی انارو چودھرن کی اگوائی میں پہونچی تو ٹھیکے کے مالک نے ٹھیکہ بند کرنے سے انکار کر دیا۔

"ہم ٹھیکہ بند کر دیں تو بھُوکے مَر جائیں گے۔"

"پیاسے تو نہیں مَرو گے۔"

"شراب بندی ہو گئی تو پیاسے بھی مَر جائیں گے۔"

یہ بات سُن کر سامنے کُھلی جگہ کھاٹوں پر بیٹھے ہُوئے آدمی اپنے اپنے گلاس لیے دُکان کے نزدیک آ گئے اور زور زور سے ہنسنے لگے۔

انارو چودھرن کو ایک دم غُصّہ آ گیا۔

"شراب کی ساری بوتلیں باہر پھینک دو ۔" وہ چیخی
اور عورتوں کی ٹولی دُکان کے اندر گھس گئی اور وہ ایک ایک بوتل کو باہر پھینکنے لگیں۔
ٹھیکے کا مالک ڈر کر دُکان سے باہر نکل آیا ۔ بوتلیں ٹوٹ رہی تھیں اور اُن میں پڑی کچی شراب مٹی پر بہہ رہی تھی ۔ ساری فضا کچی شراب کی بُو سے بھرتی جا رہی تھی ۔
"کتنا ظلم ہو رہا ہے ۔" شراب پیتے ہوئے ایک آدمی نے اپنا خالی گلاس زمین پر پھینکتے ہوئے کہا ۔
یہ سُن کر انارو چودھرن آگ بگولہ ہو گئی ۔ اُس نے دُکان سے شراب کی ایک بھری ہوئی بوتل اس آدمی پر زور سے پھینکی ۔ آدمی تو بچ کر بھاگ گیا لیکن بوتل کے ٹکڑے اِدھر اُدھر بکھر گئے ۔
شراب کا ٹھیکہ پوری طرح خالی ہو گیا تھا ۔
"کل سے دُکان مت کھولیو ۔"
دُکان کا مالک خاموش رہا ۔ اس وقت کچھ بھی بولنا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا ۔
شراب کی جو بوتلیں عورتوں نے باہر پھینکی تھیں ، اُن میں سے ساری کی ساری نہیں ٹوٹی تھیں ۔ دو چار بوتلیں ثابت بھی بچ گئی تھیں ۔ جب انارو چودھرن اپنی ساتھنوں کے ساتھ چلی گئی تو ٹھیکے کے مالک نے شراب کی وہ بوتلیں جو ٹوٹی نہیں تھیں ، ایک ایک کر کے اُٹھائیں اور اُنھیں دُکان کے اندر رکھ کر ، دُکان میں تالا ڈالا اور بڑی بے بسی کے عالم میں اپنے گاؤں چلا گیا ۔
اِس ایک گھٹنا نے آس پاس کے گاؤں کی عورتوں کا بھی حوصلہ بڑھا دیا اور شراب نوشی کے خلاف مہندر گڑھ ، ریواڑی اور اُن کے ساتھ لگتے علاقوں میں یہ آندولن زور پکڑ گیا ۔
چناؤ میں حکمران پارٹی کا پانسہ پلٹنے میں دیہات کی عورتوں کا بڑا ہاتھ تھا ۔ شراب بندی کے اعلان ہی نے ہریانہ وِکاس پارٹی کو ودھان سبھا میں اکثریت دِلا دی اور اِن کے نیتا چودھری بنسی لال نے ایک بار پھر مکھیہ منتری کی حیثیت سے ہریانہ پرانت کی باگ ڈور سنبھال لی ۔

وعدہ کے مطابق حکومت سنبھالتے ہی مکھیہ منتری نے سارے ہریانہ میں پہلی جولائی ۱۹۹۶ء سے شراب بندی کا سرکاری اعلان کر دیا اور اس سلسلے میں جو احکام جاری کرنے ضروری تھے وہ بھی کر دیئے۔

ہریانہ میں مکمل طور سے شراب بندی کر دی گئی تھی۔

طرح طرح کے ردِّعمل سامنے آئے لیکن مجموعی طور پر سماج کے سبھی ورگوں نے اس کا سواگت کیا۔

جہاں جہاں شراب کے ٹھیکے چل رہے تھے، رات کی رات میں بند کر دئے گئے تھے۔

شراب بندی سے جو آرتھک نقصان ہوگا سرکار اُس کو برداشت کرنے کے لیے تیار تھی۔

کچھ بھی ہو اب ہریانہ میں کوئی بھی آدمی شراب نہیں پیئے گا۔

البتہ سماج کے اُس اقلیتی حصّے نے جو شراب پینے کا عادی تھا، اپنی لت کو پورا کرنے کے لیے عجیب عجیب طریقے تلاش کر لیے تھے۔ وہ طریقے گھٹیا بھی تھے اور سماج وِرودھی بھی!

اور پھر اچانک ایک ایسی گھٹنا ہوگئی جس نے انارو چودھرن کے گھر پہ مانو بجلی گرا دی۔

سب کچھ جل کر راکھ ہوگیا۔

اُس کی بیٹی گجُری بیوہ ہوگئی تھی۔

سُورج معمول کے مطابق صبح اپنے کھیت میں گیا تھا۔ شام تک نہیں لوٹا۔ وہ تو بڑا سیدھا سادہ لڑکا تھا۔ کہیں آتا جاتا نہیں تھا۔ گھر میں سب فکر کرنے لگے تھے۔ گجُری مَن ہی مَن میں بڑی بے چین ہو رہی تھی۔ بہت دیر تو وہ چُپ رہی، لیکن آخر اُس نے اپنی ساس سے کہا کہ وہ سُورج کو تلاش کریں۔ کہاں چلا گیا تھا وہ۔

"امرُو، سورج کِت چلا گیا سے؟" امرُو کی ماں نے اس سے پُوچھا۔

"گیا تو کھیت ہی میں تھا ماں۔"

"امرو، تو تلاس کرنا اپنے بھائی کو۔" گجری نے امرو سے کہا

"جاتا ہوں سجا بھی۔"

امرو جانے لگا تو اُس کا باپ جگ پال بھی ساتھ ہو لیا۔ اب تو جگ پال بھی پریشان ہو رہا تھا۔

کھیت میں پہونچے تو انھوں نے دیکھا بیچ کھیت میں سُورج بے سُدھ پڑا تھا۔ اس کی ساری دیہہ نیلی ہو رہی تھی۔ پچھلے کئی دنوں میں کھیت میں کئی بار ایک ناگن دِکھی تھی جگ پال کو۔ اس طرح پھنکارتی تھی کہ دِل دہل جاتا تھا، اُسی نے ڈس لیا تھا سُورج کو۔ صبح ہی ڈسا ہو گا۔ اب تو زہر سارے جسم میں پھیل چُکا تھا۔ مُنہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔ جگ پال نے جب سُورج کو ہلایا ڈلایا تو اس میں جان ہی نہیں تھی۔ اُس کا جسم تو مُردہ ہو چُکا تھا۔ بہت تڑپا ہو گا بے چارہ۔ جگ پال اور امرو زور سے دھاڑے۔ اُن کی چیخ سُن کر ساتھ کے کھیت سے تین چار جنے آ گئے۔ سُورج کو اس حالت میں دیکھ کر تو اُن کے ہوش اُڑ گئے۔ جب سُورج کی لاش کو گڈے میں لاد کر یہ لوگ اس کے گھر پہونچے تو کہرام مچ گیا۔ گجری تو سُورج کے مُردہ جسم سے لپٹ کر دہاڑیں مارنے لگی۔ ماں اپنے مُردہ بیٹے کے سَر کو گود میں رکھ کر سیاپا کرنے لگی۔ تھوڑی ہی دیر میں سارا گاؤں اکٹھا ہو گیا۔ کئی سالوں کے بعد گاؤں میں ایسی دردناک جوان موت ہُوئی تھی۔ عورتوں نے بڑی مشکل سے گجری کو سُورج کے مُردہ جسم سے الگ کیا۔ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

ناگ کے ڈسنے کا علاج کرنے والے پُرانے اور دُور دُور تک پہچانے جانے والے گارُڑو آئے لیکن وہ کرتے بھی کیا۔ پُورا ایک دِن گذر گیا تھا، اب تو زہر نس نس میں رچ چُکا تھا۔ کوئی بھی علاج ممکن نہ تھا۔ سب مایوس ہو کر لوٹ گئے۔

جگ پال نے لوگوں کے ہزار منع کرنے پر بھی سُورج کے مُردہ جسم کو گاؤں کے شمشان میں نہیں جلایا۔ اُس نے اپنے بیٹے کی چِتا اپنے کھیت میں، ٹھیک اُسی جگہ بنائی جہاں ناگن نے اُسے ڈسا تھا۔ فصل سے بھرے کھیت میں جب چِتا کے شعلے آکاش کی طرف اُٹھے تو

درختوں پر بیٹھے پکشی چیخ چیخ کر اِدھر اُدھر پھڑ پھڑانے لگے۔ ہوا تیز تھی اور شعلے ہر طرف لپک رہے تھے۔ چاروں طرف سارا گاؤں کھڑا رو رہا تھا۔ ایسا دردناک منظر تو کسی نے نہیں دیکھا تھا کبھی۔ مانو قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔

دوسری بار تو قیامت ٹوٹی تھی انارو چودھرن کے گھر پر۔ جب اُسے سُورج کی موت کی خبر ملی تھی۔

آنگن کے عین درمیان کھڑی انارو اپنی چھاتی پیٹ رہی تھی اور بین کر رہی تھی۔ اُس کا گھر، آنگن کی کچّی دیوار اور چھت بھری پڑی تھی عورتوں سے۔ سب رو رہی تھیں۔ لگتا تھا سارا گاؤں چیخ رہا تھا۔ تمام گاؤں ماتم کر رہا تھا۔ گلی کے باہر لوگ کھڑے تھے اور اُن کے درمیان سرُوپا پتھر کے بُت کی طرح بے جان کھڑا تھا جیسے اُس پر بجلی گر پڑی تھی۔

کریا کرم والے دِن سرُوپا اور انارو گُجری کی سسرال کے گاؤں گئے اور پھر اگلے دن اپنی بیوہ بیٹی کو لے کر اپنے گاؤں لوٹ آئے۔

جس گھر سے کچھ مُدّت پہلے گُجری کی ڈولی اُٹھی تھی۔

اُسی گھر میں گُجری اپنی مانگ کا سیندور اُجاڑ کر اور کلائیوں میں پڑی کانچ کی رنگ برنگی چوڑیاں تڑوا کر، ایک وِدھوا بن کر لوٹی تھی۔

گُجری کا دُکھ اور ناقابلِ برداشت درد جس طرح انگوری نے پہچانا تھا، کسی دُوسرے نے نہیں پہچانا تھا۔ اُس نے گُجری کو اپنے مضبوط بازوؤں میں لے کر زور سے اپنے ساتھ چمٹا لیا اور اپنے گرم گرم آنسوؤں سے سُرخ بِندی سے خالی ماتھے کو دھو ڈالا۔

"میں تمہارے ساتھ ہوں گُجری، مجھ پر بھروسہ رکھو!"

"اور کس پر رکھوں گی؟" گُجری نے سِسکتے ہُوئے کہا اور مضبوطی سے انگوری کے جسم کے ساتھ لگ گئی۔

انگوری نے واقعی گُجری کو سنبھال لیا تھا۔ دن بھر اُسے ساتھ رکھتی تھی۔ رات کو اُسے سُلاتی بھی اپنے ساتھ ہی تھی۔ کئی بار انگوری کو لگا کہ گُجری بہت دیر تک جاگتی رہتی تھی اور چُپ چاپ روتی رہتی تھی۔ لیکن وہ ٹوکتی نہیں تھی اُسے۔ آنکھوں میں اُبلتا ہُوا درد تو آنسوؤں ہی کی

شکل میں باہر نکلے گا ورنہ تو اندر رہ کر نس نس کو جلا ڈالے گا۔

انگوری نے گاؤں کی عورتوں اور لڑکیوں کے لیے ایک سلائی کیندر چلا دیا تھا۔ دِن کا زیادہ تر حصّہ وہ وہیں گزارتی تھی۔ عورتوں کا بھی بھلا ہو رہا تھا اور اسے گھر میں اکیلاپن بھی محسوس نہیں ہوتا تھا۔ دھیرے دھیرے اُس نے انارو سے کہہ سُن کر اور گجری سے منت کر کے اُسے اپنے ساتھ سلائی کیندر میں جانے پر راضی کر لیا تھا۔ گجری کے آجانے سے لڑکیاں بہت خوش ہوتیں۔ جوں جوں دِن گزرتے گئے گجری کا مَن بھی سلائی کیندر میں لگنے لگا۔ اس نے سلائی کا کام اپنی سسرال کی گاؤں میں سورج کے کہنے پر سیکھ بھی رکھا تھا۔ اس کا ہاتھ بہت صاف تھا اور وہ کپڑے بہت صفائی سے سیتی تھی۔ گاؤں کی عورتوں نے کچھ ہمدردی کی وجہ سے اور کچھ اس کے اچھے کام کے کارن گجری کو اپنے اور اپنے بچوں کے کپڑے سلنے کو دینے شروع کر دئے تھے۔ اپنے کام میں مصروف رہنے کے کارن گجری کی آتما کو جلا دینے والا درد بھی کچھ کم ہو گیا تھا۔

انگوری نے کالی چرن کو سورج کی موت کی خبر دے دی تھی۔ لیکن اُسے گاؤں آنے میں کچھ سمے لگ گیا تھا۔ اُس کے کئی ساتھی چھٹی پر گئے ہوئے تھے اس لیے اُس کی چھٹی منظور ہونے میں کئی دِن لگ گئے تھے۔ لیکن ایک طرح سے اس کا اُس کا دیر سے گاؤں آنا ٹھیک ہی رہا۔ پہلے آجاتا تو اپنی بہن کا اتھاہ درد برداشت نہ کر سکتا۔ اب تو کڑا وقت گذر گیا تھا کسی حد تک۔ لیکن پوری طرح سے تو نہیں گذرا تھا۔ درد کم ہی تو ہوا تھا بالکل مٹا تو نہیں تھا۔ روح میں کسک تو باقی تھی ہی۔ اس کا احساس انگوری کو بھی تھا اور کالی چرن کو بھی۔

کالی چرن کے گاؤں واپس آنے پر انگوری اُس رات تو کالی چرن کے پاس سوئی لیکن اُس کے بعد وہ گجری کے ساتھ ہی سونے لگی۔

"گجری اکیلی سوئی تو مر جائے گی۔" انگوری نے کالی چرن سے اگلی صبح کہا تھا۔

"تو تم اسی کے ساتھ سویا کرو۔"

"تمہیں بُرا لگے گا؟"

"نہیں۔ اس وقت گجری کا دُکھ بانٹنا ضروری ہے۔"

دوسری رات انگوری جب گجری کے ساتھ اُسی کی کھاٹ پر اُس کے ساتھ سوئی تو گجری دیر تک اس کی چھاتی سے لگی روتی رہی۔ یہ شکرگزاری کے اظہار کے آنسو تھے۔ انگوری نے اس کے درد کو پہچان کر اس پر بہت بڑا احسان کیا تھا۔ اس کے لئے وہ اپنے بھائی کالی چرن کی بھی احسان مند تھی۔ اُسی نے تو انگوری سے کہا ہوگا کہ وہ رات کو گجری کے ساتھ ہی سویا کرے۔

گجری کی سسرال والوں نے موقع کی نزاکت کو نہیں پہچانا اور جلدی کر دی۔

ایک دِن گجری کا سُسر جگ پال بنا کسی اِطلاع کے بیرلی گاؤں آ گیا۔

دراصل وہ کالی چرن کے گاؤں میں آنے کا فائدہ اُٹھانا چاہتا تھا۔ وہ یہ تجویز لے کر آیا تھا کہ لتا اوڑھانے کی رسم کر دی جائے اور گجری کا بیاہ سُورج کے چھوٹے بھائی امرو سے کر دیا جائے، جس کی عُمر گجری سے بھی بہت کم تھی۔ اس وقت گجری کی جو ذہنی کیفیت تھی وہ اتنی پریشان کُن تھی کہ اس کے سامنے ایسا کوئی سجھاؤ رکھنا ہی غلط تھا۔ گجری نے تو بس ایک بار اپنے سسر کے پاؤں چھوئے اور اس کے بعد پھر اُسے وہ نظر ہی نہیں آئی۔ جگ پال نے اس بات کا ذِکر سرُوپے سے کیا۔ سرُوپے نے اپنی طرف سے حامی نہیں بھری۔ صرف اِتنا کہا کہ وہ انارو اور کالی چرن سے بات کرے گا۔

سرُوپے نے شام کو گجری اور انگوری کی غیر حاضری میں انارو سے بات کی۔

"مجھے تو نا چھے سے یو بات۔" انارو نے کہا

"تو کے جواب دُوں جگ پال کو؟"

"کالی چرن سے پوچھ لو۔"

سرُوپے نے پھر کالی چرن سے بات کی

"پاگل ہو رہا ہے گجری کا سُسرا۔ ایسی بات کرنے کا یہ وقت ہے کیا!"

"تو کے کروں۔"

"اِنکار کر دو چاچا۔ وہ ضد کرے تو میرے سے بات کراؤ۔"

"گجری سے بھی پوچھ لو۔"

اپنے باپ کے کہنے پر کالی چرن نے انگوری کے سامنے ہی گجری سے بات کی۔ گجری خاموش رہی۔ وہ اس ذہنی حالت میں نہیں تھی کہ اس طرح کی بات سوچ بھی سکتی۔

کالی چرن کی بات کا جواب انگوری نے دیا۔

"صاف انکار کر دو۔ گجری ہمارے پاس اور اسی گھر میں رہے گی۔ اور چودھری کو کہو کہ دوبارہ وہ اس بات کا ذکر نہ کرے۔"

اگلے دن جگ پال چلا گیا۔

اُس کے جانے سے پہلے گجری نے اس کے پاؤں ضرور چھوئے تھے۔ یہ پرتھا کا سمان تھا۔

شراب بندی کا آندولن تیز ہو گیا تھا۔

اس میں زیادہ سہیوگ عورتوں ہی کا تھا۔ ہریانہ کی عورتوں کے ساتھ اب تک بہت زیادتیاں ہوتی رہی تھیں۔ گاؤں کی عورت سب سے پہلے جاگتی تھی۔ سارا دن کھیت اور گھر میں کام کرتی تھی۔ سب سے کم خوراک اُسے ملتی تھی اور کئی بار بھوکے پیٹ سب سے آخر میں سوتی تھی۔ اور بہت بار اپنے شرابی گھر والے سے گالیاں بھی کھاتی تھی اور کبھی کبھی پٹائی تک بھی نوبت آجاتی تھی۔ گھر کا کوئی آدمی اس انیائے کے خلاف آواز نہیں اُٹھاتا تھا اور خاموشی سے سب کچھ کھلی آنکھوں سے دیکھتا رہتا تھا۔ سماج نے چپ چاپ یہ قبول کر لیا تھا کہ ہریانہ کی عورت کو سماجی زندگی میں کوئی اہمیت حاصل نہیں تھی۔ یہانتک کہ اس کا چوپال پر چڑھنا بھی سماج کو منظور نہیں تھا۔

اور یہ سب بیسویں صدی میں ہو رہا تھا۔

وہ سب اکیسویں صدی کی دہلیز پر کھڑے تھے لیکن نئی صدی کا دروازہ کھولنے سے انکار کر رہے تھے۔

آنے والی صدی کا دروازہ اب ہریانہ کی عورت کھٹکھٹائے گی، بہت زور سے۔ آہستہ سے نہیں۔ کیوں کہ مرد اکیسویں صدی کی روشنی سے گھبرا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اُس تیز روشنی سے چُندھیا جائیں گی۔

وہ بیسویں صدی کے دَم توڑتے ہوئے اندھیرے میں شراب پی کر، ٹوٹی ہوئی کھاٹ پر پڑے رہ کر، یہی سوچتا رہے گا کہ نشے کا اندھیرا ہی اس کی زندگی تھی۔ اور اسے نئے سورج کی روشنی کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

ہریانہ کی تقدیر سارے دیش کی تقدیر سے جُڑی تھی۔

ہریانہ کی تقدیر کوئی الگ شے نہیں تھی۔

ہریانہ کی تقدیر چمکے گی تو اس کی چمک دیش بھر میں دِکھائی دے گی اور اسی چمک سے دُنیا بھر کی تقدیر روشن ہو سکتی تھی۔

دُنیا کی تقدیر اب ہریانہ کی عورت کے ہاتھ میں تھی۔ اور اس کے ہاتھ بے حد مضبوط تھے، کیوں کہ انہی ہاتھوں سے دھرتی کی بیٹی نے کھیتوں میں بھرپور فصلوں کو کاٹا تھا اور اونچے اونچے کھلیانوں کو اُسارا تھا۔

مرد سوتا رہے نشے کی حالت میں اور گھر کی دولت کو اُجاڑتا رہے اور اسے برباد کرتا رہے۔

جمنا بھی چھُٹی لے کر گاؤں آگیا تھا۔

وہ دُکھ کے اِن کھشنوں میں اپنے دوست کالی چرن کا ساتھ دینا چاہتا تھا اور اپنی بہن انگوری کے غم میں شریک ہونا چاہتا تھا اور گجری کو یقین دِلانا چاہتا تھا کہ وہ دَرد کے اِن کھشنوں میں اکیلی نہیں تھی، وہ سب اُس کے ساتھ تھے۔

اُس کی ماں انارو چودھرن

اُس کا باپ سروپا چودھری

اُس کا بھائی کالی چرن
اُس کی بھابھی انگوری
اور وہ خود بھی ۔

جب وہ کالی چرن سے ملنے بیرلی گاؤں آیا تو کالی چرن کو مصیبت کے اِن دنوں میں اُس کا آنا بہت اچھا لگا۔ گفتگو کے دوران اس نے بتایا کہ گجری کا سسُر یہ تجویز لے کر آیا تھا کہ لتا اوڑھانے کی رسم اَدا کر کے گجری کا بیاہ اُس کے دیور امرُو سے کر دیا جائے اور یہ کہ اُن سب نے اُس کی تجویز کو ٹھکرا دیا تھا اور یہ فیصلہ کرنے میں انگوری ہی نے پہل کی تھی ۔ جمنا کو یہ سُن کر بڑا سنتوش ہُوا ۔

" ایسا ہی کرنا چاہیئے تھا ، کالی چرن ۔"
" تم سہمت ہو اس سے ؟"
" سو فی صدی ۔"
" لیکن ہمیں گجری کے بارے میں کچھ تو سوچنا ہی ہوگا ۔"
" ابھی تھوڑا اِنتظار کر لو ۔"
" وہ تو کریں ہی گے ۔"

جمنا نے جتنی بار بھی گجری کو دیکھا اُسے لگا کہ بے چاری پر قیامت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ انگوری نے اُسے بتایا کہ اس نے گجری کو کام پر لگا دِیا تھا اور وہ کچھ نہ کچھ ہر قسم بھی کما لیتی تھی اور دِھیرے دِھیرے دُکھ کی اُس گپھا کے باہر جھانک بھی لیتی تھی جہاں سُورج کا اُجالا بھی تھا اور دُھوپ بھی تھی ۔ انگوری کو یقین تھا کہ وہ اور کچھ سمے کے بعد سنبھل جائے گی ۔

جمنا اور انگوری اکیلے بات کر رہے تھے ۔
" ایک بات پُوچھوں تم سے ؟"
" پُوچھو ۔"
" گجری کیسی لڑکی ہے ۔؟"
" بڑی معصُوم اور سادہ ۔"

"تمہارے ساتھ کیسی ہے وہ ؟"

"مجھ پر تو اُسے اٹوٹ وشواس ہے۔"

"ایک بات اور پوچھوں ؟"

"پوچھو ناجمنا، پوچھتے کیوں نہیں۔"

"میں گجری سے بیاہ کر لوں ؟"

یہ بات سُن کر انگوری کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اُس نے اپنے بھائی کا ہاتھ زور سے دبوچ لیا۔

"وہ تمہارے ساتھ بہت خوش رہے گی۔"

"تمہارا یہی خیال ہے !"

"ہاں !"

"تو کیا کروں ؟"

"اِنتظار کرو۔"

"وہ تو کر ہی رہا ہوں۔"

"ابھی اور اِنتظار کرو۔ میں کالی چرن سے بھی بات کروں گی اور گجری سے بھی۔"

"اگر اُس نے اِنکار کر دیا ؟"

"تو پھر اپنی ساس سے بات کروں گی۔"

"انارو چودھرن سے ؟"

"ہاں۔"

"وہ تو بہت بڑی نیتا ہے۔"

"لیکن بہت جہان جہلا ہے۔"

"اگر اُس نے بھی اِنکار کر دیا ؟"

"وہ اِنکار نہیں کرے گی۔"

"تمہیں اس پر اتنا بھروسہ ہے ؟"

"ہاں۔ میں بھی تو اُس کے ساتھ نیتاگری کرتی ہوں۔"

پھر دونوں بہن بھائی کھُل کر ہنسے ، اُن کی ہنسی سُن کر انارو اُدھر آ گئی۔

"کے بات سے بھائی۔ ہنس کیوں رہے سو ؟"

"انگوری کہہ رہی تھی، وہ بھی آپ کے ساتھ نیتا گری کرتی ہے ۔"

"ٹھیک ہی تو کہہ رہی سے ۔ تم بھی سامل ہو جاؤ ۔"

"یہی سوچ رہا ہوں ۔"

پھر کالی چرن بھی آ گیا

"اِسے بھی سامل کر لو ۔" انارو بولی

"یہ تو ویسے ہی ہمارے فوجی میس کا نیتا ہے ۔"

سارے ہی نیتا کٹھے ہو رہے سیں ۔ ڈوبے گا یو گھر تو ۔"

"یو تو ترے گا ۔" جمنا نے جواب دیا۔

"پر سروپا چودھری ڈوبے گا اِسے ۔" انارو چودھرن نے ہنستے ہوئے کہا۔ "پر میں ڈوبنے نہیں دوں گی ۔" وہ باہر جانے کو دروازے کی طرف مُڑی ۔

"کہاں جا رہی ہو ماں ؟"

"پڑوس کے گھر میں جھگڑا ہو گیا سے ۔ جرا نمٹا آؤں ۔"

انارو چودھرن یہ کہہ کر زور سے ہنسی اور پھر دروازے سے باہر نکل گئی۔

جمنا، انگوری اور کالی چرن باتوں میں لگ گئے ۔

گجری اندر کرتے میں بٹن ٹانک رہی تھی ۔

سروپے کی سات دن کی بادشاہت ختم ہو گئی تھی ۔

اُسے اُس کے خیالی تخت سے اُتار کر ناہموار زمین پر پھینک دیا گیا تھا۔ انارو کے صندوق میں رکھے گہنوں میں سے جو دو تین گہنے وہ چُرا کر راجستھان کے اِس گاؤں میں

آیا تھا وہ بِک چُکے تھے۔ بیرلی گاؤں کے پاس دو ایک اور گاؤں سے بھی دو چار لوگ اپنی اُگائیوں کے گہنے چُرا کر یہاں شراب کے ٹھیکے پر گھٹیا قِسم کی شراب پینے کے لیے آئے ہُوئے تھے۔ زیور بیچنے سے جو رقم اُنھیں مِلی تھی وہ سب انہوں نے شراب پینے اور ڈھابوں سے کھانا کھانے پر خرچ کر دی تھی۔ شراب کے ٹھیکے دار نے ٹھیکے کے سامنے ہی جھِلنگا کھاٹیں ڈال رکھی تھیں۔ راجستھان کی سیما پر بسے ہریانہ کے کچھ گاؤں کے لوگ جو شراب پینے کے عادی تھے، شراب بندی لاگو ہونے کے بعد، راجستھان کے ٹھیکوں پر آجاتے تھے اور شراب پی کر اپنے گاؤں میں واپس جانے کے بجائے رات کو یہیں گھٹیا قسم کی کھاٹوں پر پڑ کر رات گذار دیتے تھے اور آپس میں گھٹیا قِسم کی مہنگی شراب پی کر سستی قِسم کی باتیں کرتے ہُوئے رات گزار دیتے تھے۔ ہریانہ کی سیما پر کڑا پہرہ تھا اور اگر گاؤں کا کوئی آدمی شراب کے نشے میں دُھت پکڑا جاتا تو اُس پر سخت قانونی کارروائی کی جاتی۔ اسی لیے شراب کے عادی لوگ رات کو اپنے گاؤں نہیں لوٹتے تھے، صبح ہی واپس جاتے تھے۔ کیوں کہ سزا کا خوف ہر وقت اِن قانون توڑنے والوں کے دماغوں پر چھایا رہتا تھا۔ اس لیے اِنہیں نشہ بھی دیر میں ہوتا تھا اور اُترتا بھی جلدی تھا۔ اس لیے وہ شراب زیادہ مقدار میں اور زیادہ دیر تک پیتے رہتے تھے۔

سرُوپے کے ساتھ جو پانچ سات لوگ دُوسرے گاؤں سے آئے تھے وہ اس سے زیادہ سمجھ دار ثابت ہُوئے تھے۔ وہ دو ایک دِن کے بعد دوبارہ واپس آنے کے اِرادے سے، اپنی جیبوں میں کچھ رقم بچا کر اپنے اپنے گاؤں لوٹ گئے تھے۔ سرُوپے کا مسلہ دُوسرا تھا۔ ایک تو وہ گہنے زیادہ لایا تھا، دوسرے اُس کے گھر میں لڑائی جھگڑے کا ماحول رہتا تھا۔ ایک طرف انارو اُسے پریشان کرتی تھی۔ دُوسری طرف اُس کا لڑکا کالی چرن اُس سے جھگڑا کرتا رہتا تھا۔ جھگڑا زیادہ تر شراب کو لے کر ہی ہوتا تھا۔

"چاچا تم کُچھ دھیان کرو اپنا۔"

"کیا دھیان کروں، تھارا کے بگاڑ رہا ہُوں؟"

"اپنی صحت برباد کر رہے ہو، گھر اُجاڑ رہے ہو۔"

"تُو گھر کو سنبھال لے ۔ مَیں جاؤں سُوں ۔"

"کہاں جاؤ گے ؟"

"کہیں تو جاؤں گا ہی ۔"

"لیکن سراب پینا نہیں چھوڑو گے ۔" بیچ میں انارو آدھمکی

"تم چُپ رہو۔ نہیں تو جبان کھینچ لوں گا ۔"

"لوگوں کی جبانیں کیسے کھینچو گے ۔ راجستھان کے ٹھیکوں پر دِن رات پڑے رہو ۔"

"اور بھی تو پڑے رہویں سے ۔ اُن کی لُگائیاں تو نہ ٹوکیں ۔"

"ٹوکیں تو مار کھاویں ۔"

"تُو بھی مار کھانا چاوے سے ۔" یہ کہہ کر سرُوپے نے مارنے کو ہاتھ اُوپر اُٹھایا تو کالی چرن نے ہاتھ پکڑ لیا ۔

"چاچا حد سے آگے نہ بڑھو ۔ ماں پر ہاتھ اُٹھایا تو بُرا ہوگا ۔"

سرُوپے نے انارو پر اُٹھا ہاتھ تو نیچے کر لیا لیکن اُس کے مَن میں آگ بھڑک اُٹھی، ویسی ہی آگ جو گھٹیا قِسم کی کچی شراب حد سے زیادہ پینے کے بعد سارے شریر کو جَلا ڈالتی ہے۔ کرودھ کی آگ بھی تو ویسی ہی ہوتی ہے، ایک دم ترک میں دہکنے والی آگ ۔

شراب کے عادی لوگ جھگڑا کریں بھی تو کِس سے کریں ۔ سرکار سے جھگڑا کرنے سے تو وہ رہے ۔ گھر والوں سے جھگڑا کریں تو گھر کا کوئی وکیتی اُن کا ساتھ نہیں دیتا۔ شراب کے ٹھیکے دار اُنھیں اُدھار شراب نہیں دیتے ۔ اُن سے جھگڑا تو ویسے ہی بے کار ہے۔ آجا کے یہ لوگ یا تو شراب پی کر آپس میں لڑیں اور یا پھر نشے کی ٹوٹ میں اپنے آپ سے لڑتے رہیں اور بھگوان کو دوش دیتے رہیں، جو نِت نئے مسئلے کھڑے کرتا رہتا ہے ۔

جس دِن سرُوپے کا جھگڑا اپنے بیٹے کالی چرن یا بیوی انارو سے ہوتا بس اُس دِن وہ گھر سے غائب ہو جاتا ۔ ایک صِرف اس کی بیٹی گجری تھی جو اُس کا درد پہچانتی تھی۔ عورتوں اور بچّوں کے کپڑے سی کر جو چار پیسے اس کے ہاتھ لگتے تھے وہ اپنے باپ کو چوری چھپے دے دیتی تھی ۔ اگر کبھی اس کی بھِنک انارو یا کالی چرن کے کانوں میں پڑ گئی تو وہ اُسے بالوں سے

پکڑ کر گھر سے نکال دیں گے ۔ یہ ڈر بھی گجری کو اندر ہی اندر کھاتا رہتا تھا۔ شاید اس بات کا احساس سروپے کو بھی ہو گیا تھا۔ اس بار جب گھر میں جھگڑا ہوا تو سروپے نے گجری سے پیسے نہیں لئے۔

"یہ بڑی شرم کی بات ہے کہ میں اپنی ودھوا بیٹی سے شراب کے لیے پیسے لوں۔ اب کی بار نہیں لوں گا۔"

"یہ میری اپنی کمائی کے پیسے ہیں چاچا۔"

"لعنت ہے مجھ پر۔ میں اپنی بے آسرا بیٹی کے پیسوں سے شراب پیوں۔"

"تو شراب پینا چھوڑ کیوں نہیں دیتے ؟"

"مشکل کام ہے گجری۔"

"کر کے تو دیکھ چاچا۔"

"ابھو نہیں۔"

"کیا ابھو نہیں، ابھو نہیں لگا رکھی ہے ؟" اُسی کشن جانے انارو کہاں سے آدھمکی تھی کھشنوں کھشنوں کی بات ہوتی ہے ۔ کئی کھشن ایسے ہوتے ہیں جن میں آدمی بڑے بڑے فیصلے کر لیتا ہے ۔ وہ کھشن ٹل جائیں تو پھر زندگی بھر قابو میں نہیں آتے ۔ یہ بھی ایسا ہی ایک نازک کھشن تھا۔ باپ بیٹی کی گفتگو جاری رہتی تو شاید سروپا کوئی فیصلہ لینے میں کامیاب ہو جاتا۔ لیکن انارو کے اچانک آجانے سے وہ کھشن بھی ٹل گیا، اور گجری اور سروپے کی بات آگے نہ بڑھ سکی۔

دوپہر کے بعد پنچایت کی بیٹھک تھی۔ انارو مہلا پنچ کے ناطے پنچایت گھر چلی گئی۔ سروپا بہت پریشان تھا۔ وہ صحن میں اُگے نیم کے پیڑ کی چھاؤں میں کھاٹ ڈال کر لیٹ گیا۔ اس وقت گھر میں کوئی نہیں تھا۔ کالی چرن کھیت میں تھا۔ انگوری اور گجری پڑوس میں گئی تھیں۔ اُنھیں لوٹنے میں کچھ دیر تو لگنی ہی تھی۔ سروپے نے سونے کی کوشش تو بہت کی پر اُسے نیند نہیں آئی۔ پھر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ ڈیوڑھی کی سانکل لگائی اور گھر کے اندر آگیا۔ شراب کی بہت طلب ہو رہی تھی اُسے۔ تین دن سے تو وہ ٹھیکے پر گیا ہی نہیں تھا۔

پیسے ہی نہیں تھے اُس کے پاس ۔ اُس نے گجری سے پیسے لینے سے بھی اِنکار کر دیا تھا۔ اب تو کوئی صورت ہی نہیں تھی ٹھیکے پر جانے کی ۔ شراب کی دُکان والا تو کبھی کسی سے اُدھار نہیں کرتا تھا ۔

"چودھری پیسے ہیں تو شراب پیو، ورنہ ہینڈ پمپ سے ٹھنڈا پانی پیو اور گھر چلے جاؤ ۔"

"ہم تو کئی میل چل کر اپنے گاؤں سے آئے ہیں " کوئی گاہک کہتا

"تو اُتنے ہی میل چل کر واپس چلے جاؤ ۔"

"اگر ہم واپس نہ جائیں ؟"

"تو کھاٹ پر گر جاؤ۔ جب مَن کرے چلے جانا ۔ کھاٹ پر گرنے کی کوئی قیمت نہیں ہے۔"

ٹھیکے کا مالک تو بڑا بے رحم تھا۔ خود تو دُکان پر بیٹھا گھونٹ گھونٹ پیتا رہتا لیکن کسی ضرورت مند کو ایک گھونٹ بھی نہ دیتا ۔ یہ سارے ضرورت مند آتے بھی تو ہریانہ کے گاؤں سے ہی تھے ۔ راجستھان کے گاؤں سے آنے والوں سے تو وہ اُدھار کر بھی لیتا تھا، لیکن دوسروں سے نہیں ۔

سروپا اس طرح کی باتیں سوچتے ہوئے گھر کے صندوقوں کو کھول رہا تھا کہ کوئی گہنا مِل جائے۔ لیکن کچھ بھی تو اس کے ہاتھ نہیں لگ رہا تھا ۔ انگوری کا صندوق اس نے نہیں کھولا ۔ کم سے کم اپنی بہو کے گہنے تو اُسے نہیں چُرانے چاہئیں ۔ اگر کہیں کالی چرن کو اس کا پتہ لگ گیا تو وہ اسے مار ڈالے گا ۔ گجری بے چاری کے پاس تھا ہی کیا۔ جو کچھ اس کے پاس ہوتا تھا اُسے وہ خود ہی اس کے حوالے کر دیتی تھی ۔ وہ تو آج بھی دے رہی تھی اُسے پیسے ۔ اُسے خود ہی شرم آگئی تھی اپنی لاچار بیٹی سے شراب کے لیے پیسے لینے سے ۔ اسی لیے اُس نے اِنکار کر دیا تھا۔ سروپے نے گجری کے چھوٹے سے لکڑی کے بکسے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ وہ تو بس انارو کا صندوق ہی ٹٹولتا رہا۔ سالی بڑی بنی پھرے سے مہلا پنچ ۔ سراب کے کھلاف اندولن میں نعرے لگا کر نیتا بننے جا رہی سے ۔ حرام جادی ۔ ابھی اس نے کپڑوں کی دو تین تہیں ہی کھولی تھیں کہ اُسے انارو کے گہنوں کی چھوٹی سی پوٹلی ہاتھ لگ گئی۔ سالی نے کیسے سنبھال کر رکھے تھے، اپنے گہنے ۔

"ایک ایک کرکے سب بیچ ڈالوں گا۔" وہ بڑبڑایا اور دو تین گہنے نکال کر پوٹلی کو کپڑوں کی تہوں میں نیچے ہی ڈال دیا۔ صندوق کو بند کیا۔ کمرے سے باہر آکر ایک بار گہنوں کو دیکھا۔ انھیں انگوچھے میں باندھ کر نیم کی شاخوں کے اندر چھپا دیا اور پھر آرام سے کھاٹ پر لیٹ گیا۔

جب تک انارو پنچایت گھر سے واپس آئی وہ اپنے گاؤں کی سیما پار کر چکا تھا۔ شام ہوتے ہی وہ راجستھان کے گاؤں کے ٹھیکے پر پہونچ گیا تھا۔

"رام رام چودھری۔" ٹھیکے کے مالک نے سروپے کو مخاطب کیا۔

"رام رام لالہ جی۔"

"تم تو دِکھے ہی نہیں، اتنے دِن۔"

"پیسے کی ٹوٹ ہورہی تھی۔"

سروپے کے اس جواب پر لالہ ہنس دیا۔

"تم تو برسوں کے پرانے گاہک ہو۔ سراب بندی کے بعد آنے والے تو برساتی مینڈک ہیں۔ برسات کے بعد سالا ایک بھی دِکھائی نہ پڑے گا۔"

"تم سے ڈر لگے سے۔ میں جانوں سوں تم گاہکوں کو کیسے ڈانٹو سو۔"

"چودھری تم تو گھر کے آدمی ہو۔ تمہیں کون کہہ سکتا ہے کچھ۔"

"شام ہوگئی تھی۔ پینے والے آنے لگے تھے۔ لالہ نے اپنے لیے گلاس میں ڈال رکھی تھی۔ گھونٹ گھونٹ پینی بھی شروع کر دی تھی اُس نے۔

"تم سے جرُوری بات کرنی سے۔"

"تو اندر آجاؤ۔"

سروپا دکان کے اندر آگیا۔ لالہ اس کا بازو پکڑ کر اُسے دُکان کے پچھلے حصّے میں لے آیا۔

"بولو چودھری۔"

سروپے نے انگوچھے میں لپٹے ہوئے گہنے نکالے اور لالہ کے سامنے کر دئے۔ گہنے دیکھ کر لالہ مسکرایا اور بولا۔

"یہ ہوئے نا پینے والوں کے ٹھاٹھ ۔ جیب میں دمڑی نہیں اور آجاتے ہیں پینے ۔
بھکاری سالے ۔"

پھر لالہ دکان میں گیا اور اپنے والا گلاس اٹھا لایا اور سروپے کے لیے بھی ایک چوتھائی گلاس بھر لایا ۔ لالہ کا نوکر گاہکوں کو نپٹا رہا تھا ۔

"میں اندر ہوں : چودھری کے ساتھ ۔"

لالہ نے جب گلاس سروپے کے آگے کیا تو تین چار دن کا پیاسا سروپا بس ایک ہی بار میں ساری شراب پی گیا ۔

لالہ نے گہنے لے لیے اور چھوٹے بڑے کئی نوٹ سروپے کی جیب میں ڈال دیئے ۔ سروپے نے نوٹوں کو گنا بھی نہیں ۔ لالہ نے اسے ایک اور گلاس بنا دیا اور سروپا جھومتا جھامتا گلاس کو ہاتھ میں تھامے یوں دکان سے باہر آیا جیسے وہ کچھ ہی کھشنوں میں بادشاہ بن گیا ہو ۔ لالہ کے نوکر نے سروپے کو نوٹوں کا گٹھا جیب میں ڈالتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور من ہی من میں کوئی یوجنا بھی بنا لی تھی ۔

دھیرے دھیرے پینے والوں کی بھیڑ چھٹ گئی ۔

ٹھیکے کا مالک خود ہی سروپے کے پاس آگیا جو کھاٹ پر بیٹھا شراب کا مزا لے رہا تھا ۔ پھر دونوں نے تھوڑی تھوڑی شراب اور پی ۔ پھر لالہ نے اپنے نوکر سے کہہ کر ڈھابے سے اپنے لیے بھی اور سروپے کے لیے بھی کھانا منگوایا ۔ جب تک کھانا ختم ہوا سب گاہک جا چکے تھے ۔ صرف وہی بچے تھے جو ہریانہ کے گاؤں سے آئے تھے اور جنہیں رات کو واپس اپنے گاؤں نہیں جانا تھا ۔ وہ سب ادھر ادھر گھوم کر اپنی اپنی کھاٹوں پر پسر گئے تھے ۔

ٹھیکہ بند کرنے سے پہلے لالہ نے سروپے کو ایک گندا سا تکیہ دیا اور کہا ۔

"چودھری تم میرے مہمان ہو ۔ ٹھاٹھ سے عیش کرو ۔"

"لالہ، رام رام ۔"

لالہ چلا گیا اور پینے والے نیم اندھیرے میں اپنی اپنی جھلنگا کھاٹوں پر باتیں کرتے ہوئے سو گئے ۔

جس پینے والے کو سب سے زیادہ گہری نیند آئی وہ سرُوپا تھا، بیرلی گاؤں کا رہنے والا۔ جس کی بیوی اپنے گاؤں کی پنچایت کی مہلا پنچ تھی اور جس کے گہنے چرا کر اُس نے ٹھیکے کے مالک کے حوالے کر دئے تھے اور جس نے شراب کی بے پناہ طلب میں یہ بھی جاننے کی کوشش نہیں کی تھی کہ لالہ نے گہنوں کی رقم دیتے ہوئے اُسے لوٹ لیا تھا اور آدھی سے بھی کم قیمت لگا کر اُس کی جیب میں چھوٹے بڑے نوٹوں کا ایک بڑا سا پلندہ ٹھونس دیا تھا۔

سرُوپا بھور تک گھوک سوتا رہا۔

بھور تک گھوک سونے کا یہ عمل سات دِن تک چلتا رہا۔

سرُوپا رات کو دیر تک جم کر پیتا۔ پھر لالہ کا نوکر اُس کے لیے پاس کے ڈھابے سے کھانا لاتا۔ اُس کے پاس کچھ دیر بیٹھ کر باتیں کرتا اور پھر دیر رات کو اپنے گھر جاتا۔ سرُوپا تو ایک طرح سے ٹھیکے کا پکا مہمان بن گیا تھا۔ بیچ میں ہریانہ کی سیما کے گاؤں سے پینے والے آتے رہتے اور اگلی صبح واپس چلے جاتے۔ دو چار پیکڑ ایسے بھی تھے جو دو دو دن وہیں پڑے رہتے۔ ایسے پینے والوں کی جان پہچان سرُوپے سے بھی ہو جاتی تھی۔

سرُوپے کی جیب ہلکی ہوتی جا رہی تھی۔ اس کو گاؤں سے آئے چھ دن ہو گئے تھے۔ اُسے ڈر تھا کہ کہیں اس کا لڑکا کالی چرن اس کو تلاش کرتا ہوا یہاں نہ آجائے۔ ایک بات اور اُس کے دماغ میں آنے لگی تھی۔ اگر انارو نے کہیں اپنا صندوق کھول کر گہنوں کی پوٹلی دیکھ لی ہو اور اسے معلوم ہو گیا ہو کہ اس کا گھر والا شراب پینے کے لیے اس کے گہنے چرا کر لے گیا تھا تو انرتھ ہو جائے گا۔ پھر تو وہ گاؤں بھی واپس نہ جا سکے گا۔ اس نے سوچا کہ وہ اپنی بچی ہوئی ساری رقم ٹھیکے کے مالک لالہ کے پاس امانت رکھ کر، دو ایک دن کے لیے اپنے گاؤں چلا جائے، اور پھر جو بھی حالات ہوں گے ان کے مطابق آگے کا پروگرام بنائے گا۔

اس رات جب لالہ ٹھیکہ بند کر کے گھر جانے لگا تو سرُوپے نے اس سے کہا

"گہنوں کی جو رقم بچی ہے اُسے تم اپنے پاس راکھ لو۔ میں دو تین دِن کے لئے گھر ہو آؤں سوں۔"

"ارے یار ایک آدھ دن اور رُک جاؤ۔ تمہاری جورو ہی کے تو گہنے ہیں، کسی اور کے تو نہیں۔"

"پھر بھی جانا ہی ٹھیک سے۔ میں تو تمہارا پکّا گاہک سوں۔ یہ ٹھکانہ چھوڑ کر کِت جاؤں گا۔"

"جیسی تمہاری مرضی ۔"

اس رات سروپے نے جی بھر کر پی اور لالہ کا نوکر بھی اسے کھانا کِھلا کر دیر تک اُس کے پاس ہی رہا ۔ اگلے دِن ٹھیکہ بند تھا اس لیے دو ایک پینے والوں کو چھوڑ کر سب چلے گئے تھے ۔ بہت سی کھاٹیں خالی پڑی تھیں ۔

سروپے نے آج چونکہ زیادہ پی لی تھی اِس لئے اُسے نیند بھی بہت زور کی آئی تھی ۔ صبح جب وہ جاگا اور معمول کی طرح اپنی جیب کو ٹٹولا تو جیب بالکل خالی تھی ۔ ایک بھی پیسہ نہیں تھا اُس میں ۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا ۔ رات کو جن دو تین کھاٹوں پر پینے والے سوئے تھے وہ بھی خالی تھیں ۔ رات ہی کو کسی نے اسے لوٹ لیا تھا ۔ وہ ایک دم تڑپ اُٹھا ۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے ۔ اُس نے اپنے کپڑوں کی طرف دیکھا ۔ میلے کچیلے ہو رہے تھے ۔ گالوں پر ہاتھ پھیرا تو سات دِن کی بڑھی ہوئی داڑھی کا دھیان آتے ہی اسے اپنے آپ سے گھِن آنے لگی ۔

آج تو ٹھیکہ بند تھا ۔ لالہ تو آئے گا نہیں ۔ اُس کا نوکر بھی تو نہیں آئے گا ۔ وہ تو کسی سے بھی اس طرح لُٹ جانے کی بات نہیں کر سکے گا ۔ کسی سے بات کرے گا بھی تو لوگ اس پر ہنسیں گے ۔ اپنی جورو کے گہنے چُرا کر ، اجنبی گاؤں میں شراب پینے آیا تھا اور چھ راتیں یہیں دُھت پڑا رہا تھا ۔ پھر وہ چوری کا شک بھی کس پر کر سکتا تھا ۔ یُوں کھُلے میں بیہوش سویا پڑا تھا وہ ۔ کوئی بھی تو لوٹ سکتا تھا اُسے ۔

سروپا دیر تک کھاٹ پر بیٹھا ، سر کو ہاتھوں میں دبوچے ، اپنے آپ سے سنگھرش کرتا رہا اور اپنی گیلی آنکھوں کو اُسی گندے انگوچھے سے پونچھتا رہا جس میں لپیٹ کر وہ انارو کے گہنے لایا تھا ۔

سروپا آخر کھاٹ سے اُٹھا ۔ ہینڈ پمپ سے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے ۔ ہاتھ منہ صاف کیے لیکن گندے انگوچھے سے پونچھے نہیں ۔ اُسے لگا جیسے اُس کا تمام جسم ٹوٹ رہا تھا ۔ سر میں بے حد درد تھا اور گلا بھی دُکھ رہا تھا ۔ اُسے محسوس ہوا کہ اُس کا بدن بھی جل رہا تھا ۔ شاید بُخار بھی تھا اُسے ۔ وہ ایک ہارے ہوئے جوئے باز کی طرح اپنے گھر کی

طرف روانہ ہوگیا۔ آج تو اُس کے گاؤں کا فاصلہ بھی بڑھا ہوا لگا اُسے۔ اتنی دُور تو اُس کا گاؤں کبھی تھا ہی نہیں۔ کچھ دُور تو وہ تیز چلا لیکن اُس کے بعد سرُوپے کی ہمت ٹوٹ گئی۔ اب اس کی رفتار بہت کم ہوگئی تھی اور سُورج کی تپش بھی بڑھ گئی تھی۔ چلنا محال ہو رہا تھا اُس کے لیے۔ جُوں تُوں کر کے آدھا سفر تو کٹ گیا لیکن آگے کا سفر طے کرنا ناممکن نظر آرہا تھا اُسے۔ ساتھ ہی پیاس بھی اُسے بے حد لگ آئی تھی۔ گلا سُوکھنے لگا تھا اُس کا۔ راستے میں ایک کنویں پر رُک کر اُس نے پانی پیا اور پھر وہیں ایک پیڑ کی چھایا میں لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر میں اُس کی آنکھ لگ گئی۔ جب اُس کی نیند ٹوٹی تو دوپہر ہونے کو تھی۔ اُس نے اُٹھ کر کپڑوں سے گرد جھاڑی اور پھر دِھیرے دِھیرے چلنے لگا۔

جب وہ اپنے گھر پہونچا تو ڈیوڑھی کے اندر پاؤں رکھتے ہی اسے چکر آگیا اور دہلیز پر ہی گر گیا۔ گھر میں صرف گجرُی تھی۔ گرنے کی آواز سُن کر وہ باہر آئی اور بڑی مشکل سے سرُوپے کو سنبھال کر اُسے کھاٹ پر ڈالا۔ اُسے بہت تیز بُخار تھا۔

"چاچا تم نے یہ کے کر ڈالا؟ کیوں چُرائے تم نے ماں کے گہنے۔ میرے پیسے بُرے تھے کیا؟"

گجرُی رو رہی تھی اور سرُوپے کے منہ پر پانی کے چھینٹے مار رہی تھی۔

اُسی کھشن انارو اندر داخل ہوئی۔

"مرنے دے نربھاگے کو۔ نِکال دے اس کو گھر سے باہر۔" وہ زور زور سے چیخ رہی تھی۔

گجرُی ہاتھ جوڑ کر کہہ رہی تھی۔

"ماں اُونچا مت بول۔ گلی محلے والے سُنیں گے۔"

"میں خود بُلا کے لاتی ہُوں گلی محلے والوں کو۔ وہ بھی تو سُنیں میری بپتا۔"

اور پھر کالی چرن بھی آگیا۔

وہ بولا کچھ نہیں۔ ماں کی کلائی پکڑ کر اُسے اندر لے گیا۔

"لوگوں کو تماشہ مت دِکھاؤ، ماں۔"

"تماسہ میں دکھا رہی ہُوں کہ تیرا نِرلج باپ؟ میں ابھی اسے پولیس کے حوالے کرتی ہُوں۔ دس نمبری چور ہے یہ۔"

کالی چرن نے ماں کے مُنہ پر ہاتھ رکھدیا۔ انارو چُپ ہوگئی۔

انگوری بھی آگئی تھی اور الگ کھڑی رو رہی تھی اور گجرسی سروپے کے آگ کی طرح جلتے ہُوئے ماتھے کو سہلائے جارہی تھی۔

انارو کے سر پر تو جیسے بھُوت سوار ہوگیا تھا۔

"میں ابھی پنچایت بُلواتی ہُوں اور پنچایت میں فیصلہ کراتی ہوں اِسے گاؤں سے نِکالنے کا۔"

وہ کالی چرن سے ہاتھ چھُڑاکر گھر سے باہر نکل گئی۔ وہ ایک ایک پنچ کے گھر گئی۔ اُنہیں پنچایت گھر میں اکٹھا کیا اور اُن سے کہا کہ وہ اُس کی بات سُن کر اُس کے گھر والے کو گاؤں سے نِکل جانے کو کہہ دیں۔ وہ چور بھی تھا اور کھُلے عام شراب بھی پیتا تھا پنچوں نے انارو کو بہت سمجھایا۔ ایسا کرنے سے سارے گاؤں کی بدنامی ہوگی۔ وہ سب اُس کے گھر جاکر سرُوپے کو سمجھائیں گے۔ لیکن انارو نہیں مانی۔

"تو میں گاؤں چھوڑ کر چلی جاتی ہُوں۔ میں اس آدمی کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔"

یہ اچھّا ہُوا کہ کالی چرن ماں کو ڈھونڈھتے ہُوئے پنچایت گھر میں آگیا۔

"تم بتاؤ کالی چرن۔ تم تو پڑھے لِکھے آدمی ہو۔ تمہاری ماں کی بات ٹھیک ہے؟"

سرپنچ نے سوال کیا

"میری ماں کی بات ٹھیک نہیں ہے۔ مہاتما گاندھی کہا کرتے تھے —— تم پاپ کرنے والے سے نہیں پاپ سے نفرت کرو۔"

"تو ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟"

"پاپ کرنے والے کو معاف کروگے تو پاپی سُدھر جائے گا۔ آپ سب میرے گھر چلو۔"

جب گاؤں کی ساری پنچایت سرُوپے کے گھر پہونچی تو اُسے ہوش آچکا تھا۔ گجری اور انگوری دونوں اُس کے بُخار سے تپتے جسم کو دبا رہی تھیں۔

کالی چرن نے سرُوپے کی کھاٹ کے پاس آکر اُسے مخاطب کیا۔

"گاؤں کی پنچایت تم سے ملنے آئی ہے، چاچا۔"

سروپے نے کھاٹ پر اُٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی۔ کالی چرن نے اسے سہارا دیکر بٹھا دیا۔

"میں انارو کا بھی دوسی ہوں اور سرکار کا بھی۔ گاؤں کی پنچایت کہے تو میں کل صُبح

گاؤں چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ آج مجھ میں ہمّت نہیں ہے۔"

"تم کہیں نہیں جاؤ گے، چاچا۔" گجری اور انگوری دونوں ہاتھ جوڑ کر سروپے کے

سامنے کھڑی ہوگئیں۔

"میں بھی کہاں چاہتی ہوں کہ تم گھر چھوڑ کر چلے جاؤ۔ بس سراب پینی چھوڑ دو۔" انارو

کھاٹ کے پاس آکر کھڑی ہوگئی اور رونے لگی۔

"آج کے بعد کبھی سراب نہیں پیوں گا۔ بھگوان کی قسم، انارو۔"

سروپے سے اب بیٹھا نہیں جارہا تھا۔ وہ کھاٹ پر گر گیا اور اُس کی آنکھوں میں آنسو

آگئے۔

کالی چرن اور انارو نے اُسے سنبھال لیا۔

گاؤں کی پنچایت کے سارے پنچ ایک ایک کر کے سروپے کے گھر سے باہر چلے گئے۔

اب اُن کا وہاں رُکنا مناسب نہیں تھا۔

"کیا حالت بنا رکھی ہے جالم تیں نے!"

انارو دُکھ بھری آواز میں بولی اور سروپے کے دھول بھرے پاؤں دبانے لگی۔

انارو کو لگا کہ بنا چھت کے اُس گھر کو اب ایک مضبوط اور پکّی چھت مل گئی تھی جس

میں وہ پچھلے تیس سالوں سے رہ رہی تھی اور جہاں وہ اپنے آپ کو سدا ہی غیر محفوظ

اور بے گھر سمجھتی رہی تھی۔